مجلس ادارت

جلد ۱۲۶ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات

ظہورِ اسلام کو چودہ سو سال گذر چکے، اس اثنا میں بہت سے ایسے عیسائی مصنفین اور مستشرقین ہوئے جو اسلامی علوم و فنون کے ماہرین ہونے کا دعویٰ کر کے اسلام کے مارِ آستین بنے، اور اپنی قلمی زہر چکانی سے مسلمانوں کی ایذا رسانی کرتے رہے۔

ان کی بڑی لمبی فہرست ہے، انھوں نے عربی زبان کی کتابوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں کئے، عربی کی قلمی کتابوں کے کیٹلاگ مرتب کئے، قرآن مجید کے ترجمے کئے، اسکے الفاظ کی فہرستیں تیار کیں، ڈکشنری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی، مسلمانوں کی تاریخیں لکھنے کا سلسلہ قائم کیا، فقہ اسلامی پر کتابیں لکھیں، السنہ مشرقیہ کے مدارس اور کتب خانے کھولے وغیرہ وغیرہ، کیا یہ ساری علمی سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں عمل میں آئیں یا ان کا مقصد کچھ اور رہا؟ بظاہر طلب علم کی خاطر انھوں نے طبیعیات، کیمیا، فلکیات، طب اور فلسفہ میں مسلمان ماہرین کی کتابیں شایع کر کے ان کے انکشافات اور معلومات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ انھوں نے ان سے جو کچھ حاصل کیا اسکو اپنی اپنی زبانوں میں ایسے ماہرانہ انداز میں پیش کیا کہ یہ ساری مستعار چیزیں ان ہی سے منسوب ہونے لگیں، اور اگر ان مسلمان فضلاء کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ان کا نام کچھ ایسا بدل دیتے ہیں کہ ان ہی میں سے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ابن زکریا رازی کو Rhazes، ابن سینا کو Avicenna، ابو القاسم خلاف بن عباس کو Albucosis، ابو مروان ابن عبد الملک ابن زہر کو Avenzour، ابن رشد کو Averroes، اور عبد اللہ بن احمد ابن علی البنا کو Aban Bethar لکھیں گے۔

ان تصانیف کو سامنے رکھ کر یا ان کے ترجموں کی مدد سے کچھ مصنفین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ضخیم کتابیں لکھیں، مگر ان کا مقصد زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ آپ کی ذاتِ طیبہ سے نفرت پھیلائی جائے، مثلاً اسپرنگر نے آپ کی سیرت لکھی تو لکھتا ہے (نعوذ باللہ) کہ اسلام محمد کی ایجاد نہیں ہے، وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہو سکتا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابلِ اعتراض ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں، ریورنڈ ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھا کہ جب تک قرآن ہے، تعدد ازدواج، طلاق، غلامی، پردہ اور عدم رواداری سے عوام کے اخلاق کی تخریب ہوتی رہے گی، گھریلو زندگی میں زہرناکی اور سوسائٹی میں خلل پیدا ہوتا رہیگا، محمد کی زندگی (نعوذ باللہ) تضاد سے بھری ہوئی ہے، وہ رحم کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن کسی قبیلہ کا قتل عام ہوتا ہے، تو بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہیں، اور معصوم بچوں کو دوزخ کی آگ میں جلائے جانے کی بھی خبر دیتے ہیں، ان کی زندگی کی ابتدا مشکلات اور شبہات سے شروع ہوتی ہے، اسلئے وہ تضاد اور تباین کا مجموعہ بن گئے،

بعض مصنفوں کی تحریریں تو اور بھی اشتعال انگیز ہوتی ہیں، مثلاً مارگولیتھ سیرت پاک کے سلسلہ میں واقعات کی تحریف کر کے یہ شبہ ناظرین کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوا، وہ آپ سے تھا بھی کہ نہیں، کیونکہ اگر وہ پیغمبر کا لڑکا ہوتا تو اتنی جلد وفات نہ پا جاتا، ایسے کذب اور افترا پر جہاد بالقلم کے بجائے جہاد بالسیف کا حکم جاری ہو تو کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہئے۔

کچھ ایسے خطا کار مصنفین بھی ہیں جو کلام پاک سے متعلق یاوہ گوئی کرتے ہیں، مثلاً نولدکی نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے اپنے مضمون قرآن پاک میں لکھا کہ پیغمبر اسلام نے ایک ہی سورہ کو مختلف لوگوں کو مختلف طریقے سے لکھا یا کبھی جو کچھ لکھاتے اس کو بدل دیتے اور کچھ حصہ تو بالکل حذف کر دیا، ان کا خود بیان ہے کہ کلام پاک سات شکلوں اور عرب کی مختلف بولیوں میں نازل ہوا اگر قرآن کا اسٹائل مکمل ہوتا تو پھر اس کا نزول اعجاز میں شمار کیا جاتا، اس کا اندازِ بیان اعلیٰ درجہ کا نہیں، پھر پیغمبر اسلام کے زمانہ میں جتنے قرآن لکھے گئے وہ سب جلا دیئے گئے، عثمان نے جو ترتیب دیا وہی رائج ہے جس کی صحت پر شکوک ظاہر ہوتے رہے وغیرہ وغیرہ، گستاو فلوگل تو مفروضہ طور پر قرآن مجید کے الفاظ کے مادے کچھ اس طرح بناتا ہے کہ اصل کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، گولڈزیہر نے

اس کی ترویج کی کہ ابتداً کلام پاک کے حروف پر نقطے نہیں دیے گئے، لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا، اور کیا پڑھا گیا، ایسے مصنف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تورات اور انجیل کی طرح اصل قرآن بھی مفقود ہے،

طامس کارلائل نے اپنے زمانہ کے ایسے مصنفین کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی تحریریں قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں، مولانا شبلیؒ نے یہ لکھ کر ان کی تحقیر کی تھی کہ ان کا یہ حال ہے کہ

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

لیکن اس موجودہ دور میں بھی ان کو کچھ سوجھتا نہیں، اور اپنی روسیاہی کا برابر سامان کرتے جا رہے ہیں، مناظرانہ تحریروں، مجادلانہ استدلالوں گمراہ کن منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات تلبیسات، دور ازکار قیاسات اور احتمالات سے معلولات کا سلسلہ پیدا کر کے اپنے تعصب کی چنگاریوں سے مستند معلومات اور واقعات کو جلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں،

کچھ عیسائی مصنفین غیر مستند ماخذوں کا سہارا لے کر تل کو پہاڑ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں، مثلاً محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی مسلمان ارباب تحقیق کے نزدیک بہت ہی غیر مستند ہے، اس کی حیثیت محض ایک داستان گو کی ہے، ایک بار استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مارگولیتھ سے زبانی گفتگو میں کہا کہ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مگر مارگولیتھ کے ساتھ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر الفرڈ گولیم اسکو مستند اور معتبر قرار دینے کے لئے علمی مجادلہ پر اتر آئے۔

کچھ ایسے عیسائی مصنفین بھی ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی بہت سی خوبیاں بیان کر کے اپنے ناظرین کو اپنی غیر جانب دارانہ تحریر اور اصابتِ رائے سے متاثر کرنا چاہتے ہیں، لیکن اسکا مقصد در پردہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو کچھ نہ کچھ تلخ گھونٹ بھی پینے پر مجبور کریں، مثلاً ایچ۔ جی ویلس اسلام کی بڑی تعریف کرتا ہے کہ اس میں لطف و کرم کی جو تعلیمات ہیں، وہ اس کی

بڑی خوبی ہے، اس میں جو توحید کا تخیل ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت کی مسخ شدہ توحید کے مقابلہ میں بہت اہم ہے پھر وہ اسلام کو یہودیت عیسائیت، مزدکیت اور مجوسیت سے زیادہ بہتر قرار دیتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہرزہ سرائی کرتا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) چالباز، فریبی اور سفاک تھے، ان کی بادشاہت میں روحانیت نہیں، انھوں نے ایک مذہب کیا قائم کر دیا کہ انکو یسوع مسیح، گوتم اور مانی کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے، دراصل وہ اس مٹی کے بنے ہوئے تھے جس سے ادنی درجہ کے آدمی بنے ہوئے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) خود پرست، ظالم اور خود فریبی تھے۔

منٹگمری واٹ کی کتابیں محمد ایٹ مکہ، محمد ایٹ مدینہ، محمد دی پرفٹ اینڈ اسٹیٹسمین بہت پڑھی جاتی ہیں، موخر الذکر کتاب میں اس نے رسول اللہؐ کے کردار کی بہت تعریفیں کی ہیں، مگر اس کے پردے میں یہ اثر ڈالنا چاہتا ہے کہ عہد نبوی کے غزوات توحید، رسالت اور اسلام کی خاطر نہ تھے بلکہ تجارتی اور معاشی تھے، آخر میں کلام پاک سے متعلق وحی الہام Revelation۔ اور تکوینی خیالات Creative imagination کی ایک پرفریب بحث چھیڑ کر ناظرین کے دلوں میں یہ شک پیدا کر دیتا ہے کہ قرآن پاک وحی کا مجموعہ ہے، یا رسول اللہؐ کے تکوینی تخیلات کی پیداوار ہے، پھر ناظرین کو اپنے سے بدظن نہ ہونے کی خاطر یہ لکھتا ہے کہ اس میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں، وہ بڑی حد تک سچے اور بالکل صحیح ہیں، لیکن اپنی تصنیفی مہارت سے کام لے کر فوراً یہ بھی لکھ جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے سارے خیالات سچے اور بالکل صحیح ہوں، اسی طرح رسول اللہؐ کا بظاہر مداح ہونے کے باوجود یہ بھی لکھتا ہے کہ انھوں نے جتنے خیالات کی ترویج کی وہ سب کے سب سچے اور صحیح نہیں ہیں۔

کینٹ ول اسمتھ آج کل بہت مشہور ہو رہے ہیں، بعض حلقوں میں وہ مسلمانوں کے ہمدرد بھی سمجھے جاتے ہیں، ان کو دکھ ہے کہ ۶ سو برس یعنی اسلام میں اب تک کوئی طامس پین یا والٹیر نہیں ہوا جو

وہ چاہتے ہیں کہ اسلام موجودہ دنیا کے موڈرنزم اور مغرب کے خیالات کے ہم آہنگ ہو کر بڑھے

یہ فرنگی تہذیب کہ جو ہے خود لب گور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر

اس قسم کے پیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے مغرب کے موڈرنزم کی میٹریلزم پریگمیٹزم اور سیکولرزم کے فلسفہ کو قبول کر لیا تو وہ اسلام سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے، ان کی زندگی اور اخلاق کا جو اپنا معیار ہے، وہ خود بخود ختم ہو جائیگا اسی لئے مسلمانوں میں اگر انقلابی اور اصلاحی تحریکیں چلتی ہیں، تو ان کو ایسے مصنفین احیا نوازی، قدامت پرستی، ظلمت پسندی اور رجعت قہقری وغیرہ کی خود ساختہ اصطلاحات کی آڑ لے کر ان کی مذمت شروع کر دیتے ہیں، تاکہ یہ بار آور نہ ہوں۔

اسی تعصب کی بنا پر عیسائی دنیا میں افسانوں، ناولوں، اخباروں کے کارٹونوں اور سنیما کی فلموں کے ذریعہ سے اسلام کے خلاف زہر چکانی برابر جاری ہے، اب تو ایسی تحریریں اور کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں جن سے عربوں، ترکوں، کردوں، افغانوں اور مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی منافرت اور کشمکش پیدا ہوتی رہے، حال ہی میں قرامطہ پر امریکہ کی ایک خاتون کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں انھوں نے بہت ہمدردانہ طور پر یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے صحیح عقائد سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔

ابھی سنہ ۱۹۶۹ء میں انگلستان سے جون لیفن کی ایک کتاب "دی ڈیگر آف اسلام" شائع ہوئی ہے، اس کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف نے کیا کچھ نہیں لکھا ہوگا، اس کو خطرہ ہے کہ مسلمان دنیا میں ایک تیسری قوت بن کر جہاد کے ذریعہ دنیا پر حاوی ہونے والے ہیں، وہ بغض و عداوت سے بھری ہوئی تحریروں میں پہلے تو مسلمانوں کے رسول کی بڑی بری تصویر کھینچتا ہے کہ انھوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کیا، اور ہر قسم کے ذرائع کو صحیح سمجھتے رہے، وہ فوجی حیثیت سے بہت ہی ظالم تھے قتل عام گوارا کر لیتے، سیاسی حیثیت سے وہ موقع پرست تھے، مذہبی رہنما کی حیثیت سے وہ جابر اور بے صبر رہے، پھر قرآن مجید کی اہمیت یہ لکھ کر کم کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ کے

زمانہ میں الہامی کتاب نہیں سمجھی گئی تھی، تیسری صدی ہجری سے یہ الہامی قرار دی گئی، اسی طرح حدیث کی اہمیت کو بھی زائل کرتا ہے کہ اس کی تدوین تو دو تین صدی کے بعد کی گئی، پھر قرآن مجید اور حدیث کی رو سے زنا، شراب نوشی، قمار بازی، چوری اور قتل کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان کا پورا تمسخر کیا ہے، قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کو توڑ موڑ کر اپنے کذب، افترا، تاویل اور تعصب کو صحیح قرار دینے کی کوشش کرتا ہے، جامعہ ازہر اور اسلامی ممالک کے تمام موجودہ سربراہوں کو اپنی زہریلی تحریروں سے مطعون کرتا ہے۔

آخر میں لکھتا ہے کہ مغرب کو اس وقت ایسے اسلام کا سامنا کرنا ہے جو خنجر نکال کر نشاۃ ثانیہ کی طرف مائل ہے، جس کے خلاف مغرب کو اپنی مدافعت کرنی ہے، اس کو اپنا دوسرا گال پیش کر کے سپر انداز نہیں ہونا ہے، اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کی خواہش ہے کہ مغرب اسلام کو کچل کر رکھ دے، خواہ حضرت عیسٰی کی تعلیم کے خلاف عمل کیوں نہ کرنا ہو، اور کب ان کی تعلیم پر عمل ہوا، ستم ظریفی یہ ہے کہ مغرب مسلمانوں کو صقلیہ اور اسپین سے نیست و نابود کر دے، صلیبی جنگ چھیڑ کر لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے، ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کو ختم کر دے، دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دے، صدیوں اسلامی ممالک کو اپنی غلامی میں رکھے، مہلک ہتھیار بنا کر اسلام کے دشمنوں کو مہیا کرے، ساری عیسائی دنیا اسلام کی بیخ کنی کی فکر میں رہے، پھر بھی یہ الزام رکھے کہ اسلام سخت اور متشدد قسم کی راسخ العقیدگی اور ناروا داری کی ترویج کرتا ہے، اور اس وقت مغرب کے خلاف خنجر نکالے ہوئے ہے۔

ایسے مصنفین کو اپنے گریبان میں منہ دے کر یہ بھی سوچنا ہے کہ انھوں نے اپنی افترا پردازانہ اور اشتعال انگیز تحریروں سے اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کو کس حد تک روکا، ان کے ہم مذہبوں نے اپنی سیاسی فریب کاریوں اور حربی چالبازیوں سے مسلمانوں کو مختلف ملکوں میں ضرور نقصان

پہونچایا، مگر دنیا میں ان کو پھیلنے سے روک نہ سکے، جوں یقین کو بادل ناخواستہ یہ اعتراف ہے کہ اس وقت مسلمان دنیا میں سات سو پچاس ملین ہیں، عیسائیوں کی آبادی نو سو پچاس ملین ہے، مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ عیسائیت اسلام سے طاقتور ہے، عیسائیت اسلام کی آرٹری (Ar-Tery) کی محض دین (Vein) ہے، اسلام عیسائیت کی طرح ایک فرقہ کے اندر محض ایک چرچ نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی کمیونٹی ہے، جو مذہب سے منسلک ہے، اور یہی اس کی مخصوص قوت ہے۔

خود مسلمانوں نے جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں، اس لحاظ سے ۱۹۷۵ء تک دنیا میں ان کی آبادی نوے کروڑ تک ہو چکی تھی، اس وقت تک ان کے چھیالیس "۴۶" آزاد ممالک ہیں، جن کی آبادی تقریباً ساٹھ "۶۰" کروڑ ہے، تیرہ ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے مگر غیر مسلموں کے ماتحت ہیں، وہاں ان کی آبادی سات کروڑ اناسی لاکھ ہے، پھر دنیا کا شاید کوئی ایسا ملک نہیں جہاں کچھ نہ کچھ ان کی آبادی نہ ہو وہاں انکی تعداد بائیس کروڑ چھیانوے لاکھ ہے۔

اسلام نے جو تعلیم دی ہے، اس لحاظ سے اب تک

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے ؎ جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے

ان سطروں کے چھپتے وقت حکومت ہند کے جناب وزیر تعلیم اور اس محکمہ کے سکریٹری نے تار کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے، کہ راشٹر پتی نے ۱۵ راگست ۷۸ء کے یوم آزادی کے موقع پر اڈیٹر معارف کو فارسی ادب و زبان میں اس کی خدمات کو پسند فرماکر سرٹیفکیٹ آف آنر کے اعزاز سے نوازا ہے، اس کے لئے وہ حکومت ہند کا شکر گذار ہے کہ علم و ادب کے خاموش خدمت گذاروں اور عزلت پسندوں پر بھی اس کی نظر رہتی ہے،

مقالات

قاضی صاعد الاندلسی اور اُن کی تاریخ علوم[1]

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خان، کلکتہ

موجودہ دور سائنس اور تکنیکی ترقی کا دور ہے، انسان چاند پر اتر چکا ہے، اور خلا میں پرواز کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ اس دور میں لوگوں کو سائنس کی تاریخ سے کافی دلچسپی ہو رہی ہے" اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جارہی ہیں، مسلمانوں نے سائنس کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے، اُس کی تاریخ مؤرخین لکھ رہے ہیں، لیکن اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ سائنس کی تاریخ لکھنے میں بھی مسلمانوں نے کافی دلچسپی لی ہے، اور یہ کہنا صحیح ہے کہ علوم کی سب سے پہلی تاریخ ایک مسلمان نے اندلس میں لکھی تھی، ان کا نام ہے ابو القاسم صاعد الاندلسی اور اس تاریخ کا نام "طبقات الامم" ہے۔

حالات زندگی | ابو القاسم صاعد بن محمد بن عبد الرحمٰن بن محمد بن صاعد الاندلسی ایک عرب قبیلہ بنو تغلب یا بنو ثعلبہ سے تعلق رکھتے تھے، جو قرطبہ میں بس گیا تھا، لیکن ان کی پیدائش المریہ میں

---

[1] یہ مقالہ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس، اجلاس ہشتم، منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۶/۷/۸ راکتوبر ۱۹۷۷ء میں پڑھا گیا تھا،

۴۲۰ھ مطابق ۱۰۲۹ء میں ہوئی تھی، ان کے دادا ابو المطرف عبد الرحمن سید ونیہ کے قاضی تھے، اور ان کے والد احمد بن عبد الرحمن بن محمد بن صاعد بھی قرطبہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ان کے حالات زندگی[1] بہت کم ملتے ہیں، اس لیے بالیقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے بچپن کا زمانہ کہاں گزرا اور انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی، البتہ ان کے پانچ اساتذہ کے نام "طبقات الامم" اور دوسرے مآخذ سے معلوم ہوسکتے ہیں، وہ تھے ابن حزم (المتوفی ۴۵۶/۱۰۶۴) ابو الولید ہشام بن احمد بن ہشام بن خالد الکنانی المعروف بہ ابن الوقشی (المتوفی ۴۸۹/۱۰۹۵) ابو محمد القاسم بن الفتح (المتوفی ۴۵۱/۱۰۵۹) طلیطلہ کے ابو جعفر احمد بن خمیس (المتوفی ۴۵۴/۱۰۶۳) اور ابو اسحٰق ابراہیم بن ادریس التجیبی (المتوفی ۴۵۴/۱۰۶۲)

ابن الوقشی اور ابن خمیس کے بارے میں قاضی صاعد نے واضح طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے ان سے تعلیم حاصل کی[2] لیکن ابن حزم کے بارے میں وہ ایسا بیان نہیں دیتے اور اس وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے کب اور کہاں ابن حزم سے پڑھا تھا، موجودہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ ابن حزم کا قیام المریہ میں تھا، اور یہ بھی کہ قرطبہ میں بھی انھوں نے سکونت اختیار کی تھی، جس کی تصدیق خود قاضی صاعد نے کی ہے[3] ممکن ہے کہ ان دونوں شہروں میں سے کسی ایک میں قاضی صاعد نے ان سے پڑھا ہو، قاضی صاعد نے ان کے بارے میں طبقات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے براہ راست ذاتی تعلق تھا، انھوں نے کتاب مذکور میں لکھا ہے کہ ابن حزم کے بیٹے نے ان کو اطلاع دی تھی کہ مختلف مضامین پر ابن حزم کی تصنیفات

---

[1] قاضی صاعد کے تفصیلی حالات زندگی کے لیے ملاحظہ فرمائیے، راقم الحروف کا مقالہ جو پروفیسر ہارون خان شیروانی کے FELICITATION VOLUME میں شائع ہوا ہے، حیدرآباد ۱۹۶۵ء ص ۳۶۵ - ۳۸۹

[2] الاندلسیہ، طبقات الامم (بیروت ۱۹۱۲ء) ص ۷۴، [3] ملاحظہ کیجیے آر. ارنالدیز کا مقالہ ابن حزم، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں نیا ایڈیشن، ج ۳، ص ۷۹۰ ـ ۷۹۹،

چار سو کے قریب ہیں[1]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاع زبانی دی گئی تھی، قاضی صاعد نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ابن حزم نے ان کو لکھ کر اپنی پیدائش کی تاریخ سے آگاہ کیا تھا[2]، جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب دونوں کا قیام ایک ہی شہر میں نہیں ہوتا تھا تو دونوں ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے تھے،

قاضی صاعد بیان کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات ابن الوقشی سے ۴۳۸/۱۰۴۶ میں طلیطلہ میں ہوئی تھی[3]، ممکن ہے کہ اسی سال انھوں نے طلیطلہ کا سفر کیا تھا، جب کہ ان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی، ان کے شباب کا زمانہ اسی شہر میں گزرا اور اس میں انھوں نے جید عالموں سے مثلاً ابن الوقشی، ابن خمیس[4]، التجیبی[5] اور دوسروں سے بھی حدیث، منطق، ادب، فلسفہ، طب، علم الحساب، اسلامی فقہ، علم ہیئت و نجوم اور تاریخ پڑھی، خاص طور پر علم الہیئۃ والنجوم اور اسلامی فقہ میں مہارت حاصل کی اور ان میں ان کی کافی شہرت ہوئی، یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ۴۳۸/۱۰۴۶ سے قاضی صاعد کا قیام مسلسل طلیطلہ ہی میں رہا، مندرجۂ بالا اساتذہ و علماء کے علاوہ طلیطلہ اور سرقسطہ کے دوسرے مسلمان اور یہودی ادبا اور علماء سے بھی قاضی صاعد کے تعلقات تھے اور ان سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہوگا۔

۳۹۹/۱۰۰۹ میں غاصب عبد الرحمن شنجول العامری کا انتقال ہوگیا اور اسی کے بعد

---

[1] ان کے بیٹے کا نام فقیہہ ابو محمد تھا، ملاحظہ کیجیے طبقات، ص ۷۶، [2] نفس المصدر، ص ۷۷، [3] طبقات، ص ۴۷، [4] ان کا پورا نام ابو جعفر احمد بن خمیس بن عامر تھا، دیکھیے نفس المصدر، ص ۴۷، ابن الآبار، تکملۃ الصلۃ، ج ۱، رقم ص ۵۷، ابن ابی اصیبعہ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۴۱ [5] ان کا پورا نام ابو اسحٰق ابراہیم بن لب بن ادریس تھا، طبقات، ص ۴۷، ابن الآبار، تکملہ، ج ۱، رقم ۳۵۱۔

بنو امیہ کی سلطنت کا اندلس میں زوال بھی ہوا[1]، ۴۲۲/۱۰۳۱ء میں عیسائیوں نے قرطبہ کو فتح کرلیا اور اس کے زوال کے بعد اندلس میں عربوں اور بربر کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئیں، ان میں اشبیلیہ، غرناطہ، مرسیہ، طلیطلہ، سرقسطہ اور بلنسیہ کی حکومتیں قابل ذکر ہیں، لیکن دو حکومتیں ابن عباد کی اشبیلیہ میں اور بنو ذوالنون کی طلیطلہ میں سب سے اہم تھیں[2]، مؤخر الذکر کو ایک قدیم بربر خاندان نے ۴۲۲/۱۰۳۲ء میں قائم کیا تھا عیسائیوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ۴۷۸/۱۰۸۵ء میں ہوگیا، بنو امیہ کے زوال کے بعد علوم وفنون کے مراکز بھی بدل گئے، اور چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کے دار السلطنت علم وادب کا گہوارہ بن گئے، اسی طرح بنو ذوالنون کا دار السلطنت طلیطلہ بھی علوم وادب کا مرکز بن گیا، اور اس کے حکمراں نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتے تھے، بلکہ وہ منجموں، فلسفیوں اور طبیبوں کے بھی سرپرست تھے، قاضی صاعد جیسے ایک ادیب اور عالم کے لئے علمی وتحقیقی کام کرنے کی فضا طلیطلہ میں بڑی سازگار تھی، ان کے علم وفضل کی شہرت نے شاید طلیطلہ کے حکمراں خاندان بنو ذوالنون کے امیر ابو الحسین یحییٰ بن اسمٰعیل بن امیر بن مطرف بن موسیٰ کی توجہ ان کی طرف مبذول کی تھی، انھوں نے قاضی صاعد کو طلیطلہ کے مالکی قاضی کے عہدے پر فائز کیا[3]، یہ عین ممکن ہے کہ ان کے استاذ ابن الوقشی نے جن کا اثر امیر مذکور کے دربار میں بہت زیادہ تھا، ان کی سفارش کی ہوگی، ان کے مزید حالات زندگی معلوم نہ ہوسکے، لیکن

---

[1] ملاحظہ کیجئے، انور شحنہ تاریخ الاندلس وثقافتہ، انگریزی میں (مینو سوٹا ۱۹۷۴ء) ص ۳۸، ۳۹
[2] انور شحنہ، نفس المصدر، ص ۶۲، ۶۳، د. م. ڈنلپ، بنو ذوالنون، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، (جدید ایڈیشن) ج ۲، ص ۲۴۲-۲۴۳، [3] ابن بشکوال، الصلۃ، تصحیح کودیرا (مجریط ۱۸۸۲-۸۳ء) ج ۱، ص ۲۲۲، رقم ۵۳۵۔

ان کی وفات کی متعین تاریخ مؤرخین نے لکھی ہے، جب وہ صرف ۴۴ سال کے تھے تو اُن کا ۶ر شوال ۴۶۲ھ مطابق ۶ر جولائی ۱۰۷۰ء کو انتقال ہوگیا[1]، ان کے جنازے کی نماز دربار کے ایک نہایت معزز عالم ابن الحدیدی نے پڑھائی تھی۔

اخلاق

ان کا کردار عیوب واسقام سے پاک تھا، اور ان میں مذہبی عصبیت بالکل نہیں تھی، علم دوستی اور مروت ان کی فطرت میں تھی، دو عبرانی مآخذ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے[2]، کہ وہ علوم وفنون خاص طور پر ہیئت نجوم کے بڑے شیدائی تھے، وہ بڑے سخی تھے، اور اپنی دولت ان لوگوں میں تقسیم کرتے، جو ان کو علم الہیئۃ والنجوم کے مطالعے اور تحقیق میں مدد دیتے، وہ رصدگاہ میں کام کرنے والوں کی بھی سرپرستی کرتے، اور اس میں وہ مذہب وملت کا کوئی فرق نہیں کرتے، طبقات کے ایک باب "العلم فی الہند" میں انھوں نے اہل ہند کی بڑی تعریف کی ہے، اگرچہ وہ جانتے تھے[3] کہ وہ بت پرست ہیں، اسی طرح انھوں نے ایک باب علوم بنی اسرائیل بھی لکھا ہے، جس میں ایک یہودی عالم اسحٰق بن قسطار کے اخلاق وکردار نیز اس کی علمیت کی بڑی تعریف کی ہے[4]، مسلمان اور یہودی منجمین کی معیت میں قرطبہ اور طلیطلہ کی رصدگاہوں میں انھوں نے ثوابت وسیارات، نجوم وافلاک نیز کواکب کے حالات معلوم کئے، وہ اسپین کے مشہور منجم الزرقانی[5] کے ہم عصر تھے، اور یہ دونوں طلیطلہ کے منجمین میں امام کی

---

[1] ابن بشکوال، نفس المصدر، حاجی خلیفہ کا یہ بیان کہ ان کا انتقال ۴۵۰/۸۶۵ء میں ہوا، صحیح نہیں معلوم ہوتا، [2] ان مآخذ کے لئے دیکھئے، مارٹن پلسنر کا مقالہ ۱۹۵۶ء،
[3] طبقات ص ۹، [4] اس باب کا نام ہے، العلوم فی بنی اسرائیل،
[5] j. M. Millas, vallicrosa esfidios sobre-azarcuiel (Madrid-granada, 1943, 1950

حیثیت رکھتے تھے، انہی دونوں کے کواکب و نجوم کے فلکیاتی مشاہدات اور تحقیق کے نتائج میں زیچ طلیطلی تیار ہوا تھا، جو یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں بہت مشہور ہوا۔

تصنیفات قاضی صاعد نے اپنی تین اور کتابوں کا ذکر طبقات الامم میں کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے، پہلی کتاب اصلاح حرکات النجوم ہے جو شاید متقدمین کے علم ہیئۃ و نجوم کے اصولوں پر مبنی رہی ہوگی، دوسری کتاب مقالات اہل الملل والنحل[1] ہے، شاید ابن حزم کی اسی موضوع پر ایک کتاب سے متاثر ہو کر قاضی صاعد نے یہ کتاب لکھی ہوگی، تیسری کتاب جوامع اخبار الامم من العرب والعجم ہے، جو شاید عالمی تاریخ تھی، کاسیری اور الزرکلی نے لکھا ہے کہ وہ تاریخ الاندلس کے مصنف تھے، انھوں نے ایک مختصر تاریخ اسلام[2] بھی لکھی تھی، لیکن طبقات الامم کے علاوہ ان کی کوئی اور کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے، یہ کتاب طلیطلہ میں ۴۶۰/۱۰۶۸ میں لکھی گئی تھی، مختلف مصنفین نے اس کتاب کا مختلف نام لکھا ہے، مثلاً التعریف بطبقات الامم، یا التعریف فی طبقات الامم، یا تاریخ الامم یا صرف طبقات، یاقوت (المتوفی ۶۲۶/۱۲۲۸) نے ایک کتاب، اخبار الحکماء سے چند اقتباسات نقل کئے ہیں، جو طبقات الامم ہی سے لئے گئے ہیں، ابن خلکان (۶۸۱/۱۲۸۳) نے اس کا ذکر طبقات الحکماء یا طبقات الاطباء کے ناموں سے کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی نام بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا ایک طویل نام صیوان الحکمۃ فی طبقات الحکماء دیا ہے، لیکن ازمنۂ وسطیٰ اور موجودہ دور کے بہت سے مصنفین نے اس کا نام صرف طبقات الامم لکھا ہے

---

[1] دیکھئے ابن حزم کی کتاب، الفصل فی الملل والنحل،
[2] ملاحظہ کیجئے مارٹن پلسنر کا مقالہ،

. . . .

جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔

طبقات الامم کے ایڈیشن اس کتاب کے صرف دو ایڈیشن پائے جاتے ہیں، لوئیس شیخو نے اس کا ایک مختصر متن مجلہ "المشرق" بیروت میں ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا، اس کے بعد انھوں نے اس کا مکمل متن حواشی، تعلیقات اور دو مختصر مقدمے، ایک فرانسیسی اور دوسرے عربی کیساتھ ۱۹۱۲ء میں شائع کیا[1]، یہ دونوں متون اٹھارہویں صدی عیسوی میں لکھے ہوئے ایک مخطوطہ پر مبنی تھے جسے لوئیس شیخو نے دمشق میں خریدا تھا، اس ایڈیشن کی دو نقلیں (REPRINT) قاہرہ سے طبع ہوئی ہیں، جن پر سنہ طباعت درج نہیں ہے[2]، ان میں کچھ ترمیم و تنسیخ اور تصحیح ضرور کی گئی ہے، لیکن ان میں کچھ اور نئی نئی غلطیاں پائی جاتی ہیں، نجف کے حیدریہ پریس نے بھی ۱۳۸۷/۱۹۶۷ میں اس کا ایک متن ۱۱۸ صفحات پر شائع کیا ہے، جو اطمینان بخش نہیں ہے،

طبقات الامم کے محتویات قاضی صاعد نے طبقات کے مقدمے میں لکھا ہے کہ نوع انسان قدیم زمانے میں صرف سات قوموں میں منقسم تھا، یہ قومیں بعد میں تین باتوں یعنی اخلاق، صورت اور زبان کی وجہ سے بہت سی مختلف قوموں میں تقسیم ہوگئیں، بعد ازاں انھوں نے دنیا کی قوموں کو دو طبقے میں تقسیم کیا ہے، پہلا طبقہ اُن قوموں کا ہے، جنھوں نے علوم کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا ہے اور دوسرا طبقہ ان قوموں کا ہے، جنھوں نے علوم سے کوئی دلچسپی نہیں لی، اس سبب سے کہ پہلے طبقے نے علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے، اس پر خدا کی خاص عنایت ہے اور دوسرا طبقہ اس عنایت سے محروم ہے۔

---

[1] کتاب طبقات الامم، المطبعۃ الکاثولیکیۃ للآباء الیسوعیین بیروت سنہ ۱۹۱۲ء، ۱۲، ۴۴ صفحات، اس میں پانچ فہارس ہیں، [2] ان میں سے ایک مطبعۃ التقدم (محمود علی صبیح) ۱۲۰ صفحات، اور دوسری مطبعۃ السعادۃ میں (صفحات ۱۳۶) کی چھپی ہوئی ہے۔

پہلے طبقے میں آٹھ اقوام مثلاً ہندی، ایرانی، کلدانی، یونانی، رومی، مصری، اسرائیلی اور عرب کو شامل کیا ہے[۱]، دوسرے طبقے میں چینی، ترکی، حبشی، سوڈانی، صقالبہ، بربر اور دوسری قومیں شامل ہیں، اس طبقہ کے تحصیل علوم سے محرومی[۲] کے اسباب بھی انھوں نے بیان کئے ہیں۔

پہلے طبقہ کے آٹھ اقوام میں سے ہر ایک کے علوم پر ایک باب لکھا ہے، اس میں ان کے ملل وادیان، منطق و فلسفہ، علم الہیئۃ اور علم النجوم اور تاریخ طبیعی سے بحث کی گئی ہے، ان آٹھ اقوام کی مختصر سیاسی تاریخ بھی لکھی ہے، قاضی صاعد کو اس علم سے خاص دلچسپی تھی، جس کو اصطلاح عام میں "تاریخ" کہتے ہیں، اس میں ان قوموں کے ادبا، شعراء اور فقہاء کے بارے میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے، اور انھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے، قاضی صاعد کے مآخذ کی وجہ سے یہ آٹھ ابواب یکساں طور پر پُر از معلومات اور اہم نہیں ہیں، اس کے پانچ ابواب جو ہندی، یونانی، عرب، اندلسی اور اسرائیلی علوم سے متعلق ہیں، نہایت اہم ہیں، اس کتاب کا سب سے پہلا باب ہندوستان کے علوم قدیمہ پر ہے اور یہ سب سے طویل اور اہم باب ہے[۳] جس میں لکھا ہے کہ اس سبب سے کہ ہندوستانیوں نے علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے، اللہ کی مہربانی ان کے شامل حال ہے، راقم الحروف نے اس باب کا عربی متن اور اس کے متعلق ایک تفصیلی مطالعہ شائع کر دیا ہے[۴]، اس کتاب میں علوم سے مراد چند خاص علوم ہیں جو مسلمانوں میں

---

[۱] طبقات، ملاحظہ کیجئے، الباب الاول، "الامم القدیمۃ" والباب الثانی: اختلاف الامم وطبقاتہا بالاشتغال، ص ۵-۸ والباب الرابع: "الامم التی عنیت بالعلوم" ص ۸-۱۱ [۲] الباب الثالث "الامم التی لم تعن بالعلوم" طبقات ص ۸-۹ [۳] طبقات ص ۱۱-۱۵، باب کا عنوان ہے العلم فی الہند، [۴] دیکھئے راقم الحروف کا مقالہ جس کا ذکر اوپر نوٹ ۱ میں کیا گیا ہے، اسی طرح راقم الحروف نے علوم فرس اور علوم کلدان کا مطالعہ بھی شائع کر دیا ہے

علوم اجنبیہ سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ علوم نہیں جن کا تعلق مذہب اسلام سے ہے، یہاں علوم کا مطلب سب سے پہلے تو فلسفہ اس کے بعد ریاضیات و فلکیات جن میں خاص طور پر علم ہیئت اور علم نجوم شامل ہیں، اس کے بعد طب، کیمیا وغیرہ دوسرے علوم ہیں۔

اس کتاب کا ماخذ قاضی صاعد نے اکثر جگہ اپنے مآخذ کا بھی ذکر کیا ہے، جو یہ ہیں[۱]، کتاب الاکلیل وصفۃ جزیرۃ العرب للہمدانی، کتاب المعارف لابن قتیبہ الدینوری، کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی، کتاب الالوف و کتاب المذاکرات لابی معشر البلخی، کتاب الفہرست لابن الندیم، صلۃ التاریخ الطبری للفرغانی، زیج ابن الآدمی معروف بہ نظام العقد، ابو حنیفہ الدینوری کی کتاب الانواء، بطلیموس کی المجسطی کا عربی ترجمہ، ابوجعفر الطبری کی تاریخ الرسل والملوک اور الوصفی کی اخبار مصر، اگر طبقات کا مقابلہ المسعودی کی کتاب التنبیہ والاشراف اور ابن الندیم کی کتاب الفہرست[۲] سے کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علاوہ اور مآخذ کے یہ دو کتابیں اُن کے نہایت اہم ماخذ رہے ہیں،

طبقات کا پہلا ایڈیشن لوئیس شیخو نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا، قاضی صاعد کے کئی ماخذ اس وقت تک طبع نہیں ہوئے تھے، اب گذشتہ ۸۰ سال میں کتاب الاکلیل[۳] کے بہت سے حصے ابو معشر البلخی کی کتاب الالوف[۴]، فردوس الحکمۃ لعلی بن ربن الطبری، تعلیل زیج الخوارزمی[۵]

---

[۱] اس کتاب کے اردو ترجمہ کرنے والے قاضی احمد میاں اختر نے انکی فہرست اپنے مقدمہ میں شائع کی ہے [۲] ان دو کتابوں میں سے المسعودی کی کتاب التنبیہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، [۳] دیکھئے آسکا لوفگرین (اپسالا، سویڈن) کی کتابیں الہمدانی پر، [۴] ان کے تلمیذ شاذان بن بحر کی کتاب المذاکرات جلد ہی شائع ہونے والی ہے، [۵] اس کتاب کو GOLDSTEIN نے نیو ہیون، امریکہ سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

زیج البتانی، السندہند الکبیر للفزاری وغیرہ شائع ہو چکی ہیں، قاضی صاحب نے طبقات میں جو حوالے اپنے ماخذ کے دیئے ہیں، اُن کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب صحیح ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان سب کتابوں سے ان کو اندلس ہی میں استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا[1]،

یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ قاضی صاعد نے ابن جلجل کی طبقات الاطباء والحکماء سے استفادہ کیا تھا یا نہیں[2]، یہ ضرور ہے کہ دونوں مصنفوں کا تعلق اندلس سے تھا اور ابن جلجل کی کتاب ۳۷۷ھ ہجری مطابق ۹۸۷ء عیسوی میں لکھی گئی تھی، جب کہ قاضی صاعد کی طبقات ۴۶۰/۱۰۸۶ کی تصنیف ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ دونوں مصنفوں کے ماخذ ایک ہی رہے ہوں، ایک طبیب کی حیثیت سے قاضی صاعد اُن سے واقف ضرور تھے،

اس کتاب کی خوبیاں طبقات سے پہلے چند ایسی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں، جن میں فلاسفہ، حکماء اور علماء کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات بیان کئے گئے ہیں، مثلاً کتاب التنبیہ للمسعودی، کتاب الفہرست لابن الندیم، طبقات الاطباء والحکماء لابن جلجل[3] اور صیوان الحکمۃ لابی سلیمان المنطقی السجستانی[4]، لیکن طبقات اپنی خاص خصوصیت کی وجہ سے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان سب سے جدا ہے، ابن جلجل کی کتاب بھی مختصر اور اہم ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ طبقات سے کیا جائے تو یہ بات واضح

[1] انھوں نے کل ۱۶۵ کتابوں کا ذکر طبقات میں کیا ہے، [2] ابن جلجل کی طبقات کے مصحح فواد سید کا قول ہے کہ قاضی صاعد نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا، دیکھئے مقدمہ، ص مہ، [3] تحقیق فواد سید مطبعۃ المعہد العلمی الفرنسی للآثار الشرقیہ بالقاہرہ، ۱۹۵۵ء، ۱۳۸ صفحات، [4] منتخب صیوان الحکمۃ کا جو ایڈیشن، ڈی۔ ایم۔ ڈنلپ نے تیار کیا ہے، بہت جلد شائع ہو جائے گا، اس کا ایک ایڈیشن عبد الرحمٰن بدوی نے طہران سے شائع کر دیا ہے،

ہو جائے گی، کہ طبقات اس سے زیادہ اہم ہے، اس سبب سے کہ طبقات کے بعض ماخذ اب ناپید ہیں، اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، مثلاً الہمدانی کی کتاب الاکلیل کے مکمل اجزا اب تک دستیاب نہیں ہوئے[1]، نہ صلۂ تاریخ طبری للفرغانی کا اب تک کہیں پتہ چلا ہے، اسی طرح الوصفی کی اخبار مصر کا کوئی مخطوطہ ابھی تک نہیں ملا، اس میں اقوامِ عالم کی تقسیم جو دو طبقے میں کی گئی ہے، بالکل نئی اور انوکھی بات ہے کہ جو متذکرہ بالا کتابوں میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ علم ہی کی وجہ سے انسان اور جانور میں فرق ہوتا ہے ورنہ بعض خصوصیات میں جانور انسان سے کچھ آگے ہی ہے[2]،

اس میں بہت سے مسلمان اور غیر مسلم علماء اور فلاسفہ کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، اس کے علاوہ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے، کہ اس میں اُن علوم کی مختصر تاریخ بھی موجود ہے، جن کو ہم آج بنیادی سائنس (FUNDAMENTALSCIENCE) کہتے ہیں، ان ہی خوبیوں کی وجہ سے بعد کے بہت سے مصنفین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکماء[3] میں اور ابن ابی اصیبعۃ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں طبقات کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، ابن القفطی نے تو جا بجا حوالے بھی دیئے ہیں، لیکن ابن ابی اصیبعۃ طبقات کی

[1] ملاحظہ کیجئے، آسکار لوفگرین کا مقالہ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جدید ایڈیشن، ج ۳، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۴۴ - ۱۱۴۵، [2] مثلاً جسمانی قوت میں شیر انسان سے زیادہ طاقتور ہے، دیکھئے طبقات ص ۱۰، [3] ایک جدید عالم رنجیس بلاشیر ریجس بلاشیر کی رائے ہے کہ اس کتاب کا چوتھائی حصہ قاضی صاعد کے طبقات الامم سے ماخوذ ہے، ملاحظہ کیجئے ان کا مختصر مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں پہلا ایڈیشن، ج ۲، ص ۸۳۱

عبارت تو نقل کرتا ہے، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ ان کے علاوہ ابن العبری نے کتاب مختصر الدول، ابن خلکان نے وفیات الاعیان، المراکشی نے المعجب فی اخبار مغرب، ذہبی نے تاریخ الاسلام، المقری نے نفح الطیب اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ اندلس کے مصنفین میں سے ابن بشکوال (متوفی ۵۷۸/۱۱۸۳) الضبی (المتوفی ۵۹۹/۱۲۰۳) اور ابن الآبار (المتوفی ۶۵۸/۱۲۶۰) نے اس کتاب سے معلومات اخذ کئے تھے۔ الجزائر کے امیر عبد القادر نے ذکری الغافل میں اور مشہور عرب ادیب کرد علی نے غابر الاندلس و حاضرھا میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے[۱]۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب کے پانچ ابواب نہایت اہم ہیں۔ علوم یونان پر جو باب ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یونان کے علوم و فلسفہ سے مسلمان کس حد تک آشنا تھے اور وہ ان کے بارے میں کتنے زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ اس کے دو ابواب جن کا تعلق علوم عرب اور علوم اندلس سے ہے، اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ کے لئے نہایت اہم ہیں، خصوصاً علوم اندلس کے بارے میں ایسے نادر اور اہم معلومات جمع کئے گئے ہیں، جو دوسرے ماخذ میں نہیں پائے جاتے[۲]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی صاعد نے یہ کتاب اندلس میں لکھی تھی۔ اور ان کا براہ راست تعلق یہاں کے بہت سے علماء سے تھا۔ موجودہ زمانے کا کوئی عالم اگر اندلس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھنا چاہے تو وہ اس باب کو نظر انداز نہیں کر سکتا[۳]۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا انداز فکر منصفانہ ہے۔ قاضی صاعد نے علوم اقوام

---

[۱] دیکھئے طبقات کے فرانسیسی ترجمے کا مقدمہ، ص ۲۲۔۲۵، [۲] طبقات "العلوم فی الاندلس ص ۶۲۔۸۰، یہ اس کتاب کا ایک طویل باب ہے، [۳] ملاحظہ کیجئے انور شحنہ کی کتاب تاریخ الاندلس و ثقافتہ (انگریزی)

کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مذہبی عصبیت سے بلند ہو کر لکھا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ "طبقات" اس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جب کہ عیسائی حملہ آور اندلس کی اسلامی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کرنے کے لئے بے شمار مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان واقعات کے دو سو سال بعد مغل حملہ آوروں نے ایران، عراق، شام وغیرہ میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا تھا، ان حالات میں بھی اس کتاب میں مذہبی تعصب کا اثر بالکل نہیں پایا جاتا۔

اُمم قدیمہ کی مدت سلطنت کے بارے میں مؤرخین میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا ذکر "طبقات" میں انھوں نے کیا ہے، اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، مثلاً ملوک فارس کی مدت سلطنت جو قاضی صاعد کے خیال میں تین ہزار ایک سو چونسٹھ سال تھی[۱]، تاریخ پر انھوں نے جو کتاب لکھی تھی، یعنی کتاب "جوامع اخبار الامم" وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوئی ہے ورنہ اقوام قدیمہ کے بارے میں قاضی صاعد کے خیالات ہمیں معلوم ہو جاتے۔ انھوں نے اس کتاب میں کم از کم ایک جگہ تاریخ طبیعی یعنی (NATURAL HISTORY) کے بعض نظریات سے بھی بحث کی ہے، جس میں وہ موجودہ زمانہ کے ایک محقق معلوم ہوتے ہیں، ان کا انداز وہی ہے جو البیرونی کا ہے، لیکن البیرونی کی کوئی کتاب شاید قاضی صاعد تک نہیں پہنچ سکی تھی، خاص طور سے ان کی آثار الباقیہ[۲]، جس میں انھوں نے امم قدیمہ کی

---

[۱] اس بحث کے لئے دیکھئے طبقات "العلم فی الفرس" ص ۱۵۔۱۶، جس کا مطالعہ راقم الحروف نے ایران سوسائٹی کے سلور جوبلی VOL میں شائع کیا ہے، [۲] ملاحظہ کیجئے، الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ للبیرونی، تصحیح اڈورڈ، زخاؤ، برلین ۱۸۷۸ء XLXXIII، صفحات ۳۶۲،

تاریخ لکھی ہے، طبقات کے اردو مترجم نے ایک مقدمہ بھی شائع کیا تھا، اس میں وہ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں،

"اس کتاب نے اہل اندلس کے ہاں بڑی قبولیت اور شہرت حاصل کر لی تھی، وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے، اور اہل مشرق کو یہ کتاب روایۃً سناتے تھے، چنانچہ جب اندلس کے ایک عالم ابو محمد عبد اللہ بن محمد مرزوق الیحصبی حج کو جاتے ہوئے اسکندریہ سے گزرے تو انھوں نے ابو طاہر سلفی (المتوفی ۵۷۶ / ۱۱۸۰) کو کتاب سنائی، یہ کتاب یحصبی نے ابن برال سے اور ابن برال نے خود صاعد سے سنی تھی۔[۱]"

جہاں اس کتاب میں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں چند خامیاں بھی ہیں، اس میں غیر مسلم علماء اور فلاسفہ کی جائے سکونت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، لیکن ان کے زمانہ کے تعین میں قاضی صاعد سے بعض غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں، یہ غلطیاں عام طور پر ان ابواب میں نہیں پائی جاتیں، جن کا تعلق عرب اور اسلام سے ہے، ایسی غلطیاں یونانی علوم و فلسفہ کے باب میں زیادہ نظر آتی ہیں، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ ابندقلیس اور فیثاغورس حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے ہم عصر تھے، موجودہ تحقیق کے لحاظ سے فیثاغورس ۵۷۱ قبل مسیح اور ابندقلیس ۵۲۱ قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے، لیکن داؤد اور سلیمان علیہما السلام بنو اسرائیل کے پیغمبر ہیں جو صدیوں پہلے گزرے ہیں۔[۲] اس غلطی کو بعد کے مصنفین نے بھی مثلاً القفطی نے "تاریخ الحکما" میں نقل کر دیا ہے، اسی طرح قاضی صاعد نے لکھا ہے، کہ

---

[۱] دیکھئے اردو ترجمہ طبقات الامم، طبع معارف پریس اعظم گڑھ، مترجم، قاضی احمد میاں اختر نے یہ عبارت ابن الابار کی "التکملہ لکتاب الصلۃ"، طبع میڈرڈ، ج ۲، ص ۴۶۳، اور المقری کی نفح الطیب طبع مصر، ج ۲، ص ۲۲ سے نقل کی ہے۔ [۲] اس پر راقم الحروف کا ایک مقالہ زیر طبع ہے۔

ارسطو نیقو ماخوس الجہراشی کے بیٹے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ ارسطو کے والد ایک دوسرے نیقو ماخوس ہیں، جو جہراش کے باشندے نہیں تھے، اور وہ ایک بالکل مختلف شخص ہیں، اگرچہ دونوں کا نام ایک ہی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ غلطی سب سے پہلے یعقوبی نے کی ہے،[۱] جن کی کتاب سے المسعودی نے استفادہ کیا تھا، اور انھوں نے کتاب التنبیہ میں اسی غلطی کو نقل کیا ہے،[۲] جس کو قاضی صاعد نے بھی نقل کر دیا ہے، اس سلسلے میں ایک اور غلطی کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس میں لکھا ہے کہ جالینوس کا زمانہ بقراط سے ۶۰۰ اور اسکندر اعظم سے ۵۰۰ سال کے بعد کا تھا، یہ غلطی بھی دراصل المسعودی کی ہے، جس کو کتاب التنبیہ سے نقل کیا گیا ہے، موجودہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ بقراط کی وفات ۳۷۸ھ قبل مسیح میں ہوئی اور جالینوس[۳] نے ۱۹۹ء میں انتقال کیا۔

اندلس کے علماء کو چھوڑ کر اس کتاب میں اقوام عالم کے علماء و فلاسفہ کے جو حالات اور ان کی کتابوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں، وہ عام طور سے دوسری کتابوں میں پائے جاتے ہیں، علوم عالم کی تدریجی ترقی کی تاریخ جو اس کتاب میں ہے، وہ بہت مختصر اور ناقص ہے، اور افکار و خیالات پر بہت کم تبصرہ کیا گیا ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قاضی صاعد نے عام پڑھنے والوں کے لئے طبقات لکھی ہو گی، اور ان کا ارادہ کوئی اہم کتاب علماء کے مطالعہ کے لئے لکھنے کا نہیں تھا، قاضی صاعد نے المسعودی، ابن الندیم اور دوسرے عرب علماء سے استفادہ تو کیا ہے لیکن ان کے بیانات کو نقل کرنے سے پہلے ان پر

---

[۱] دیکھئے تاریخ الیعقوبی، دار صادر بیروت ۱۹۶۰ء ج ۱ ص ۱۲۳، جس میں ان کو نیقوماخوس الحکیم الفیثاغوری، مصنف کتاب الارتماطیقی لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، [۲] ملاحظہ کیجئے خیاط بیروت ایڈیشن ۱۹۵۶ء ص ۱۱۶، [۳] المسعودی، کتاب التنبیہ، ص ۱۳۱۔

تنقیدی نظر نہیں ڈالی، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے عام طور سے بجنسہٖ نقل کر دیا ہے، بجز
ایک دو مقام کے جہاں ان بیانات پر انھوں نے شک کا اظہار کیا ہے۔

اس کتاب میں ایک بیان بہت ہی افسوسناک ہے اور اگر قاضی صاحب ایسا نہ لکھتے
تو اچھا تھا، انھوں نے العلوم عند العرب کے باب میں لکھ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علوم فلسفہ سے
اہل عرب کو مستفید نہیں کیا، اور نہ ان کی طبیعتیں اس فن کی استعداد و مناسبت رکھتی تھیں،[1]
وہ خود عربی النسل تھے، اس لئے اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی فاحش غلطی کس
طرح کی ہے، مسلمان مشاہیر اور اکابر علماء و فلاسفہ کے حالات زندگی کا غور سے مطالعہ کرنے
سے معلوم ہوگا کہ وہ نسلاً خالص عرب تھے، جہاں جہاں بھی غیر ملکوں میں عربوں نے سکونت
اختیار کی وہ وہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی عربی انفرادیت
ختم ہوگئی، ایران میں ایرانیوں کے ساتھ اور اندلس میں ہسپانوی اور پرتگال کے لوگوں
کے ساتھ عرب قبیلے شیر و شکر ہو گئے اور انھوں نے اپنی انفرادیت کھو دی، ابن خلدون کا یہ
بیان کہ مسلمان علماء و فلاسفہ کا زیادہ تر حصہ غیر عرب تھا، قاضی صاعد کے بیان سے بھی
زیادہ افسوسناک ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ ابن خلدون اپنے اس نظریئے میں قاضی صاعد
کے اس بیان سے متاثر ہوئے ہیں، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ صرف دو[2] فلسفی خالص عربی
نسل کے تھے، پہلا ابو اسحٰق الکندی اور دوسرا الہمدانی۔[3] لیکن جس نقطۂ نگاہ سے ہم الکندی
کو فلسفی کہتے ہیں، اس سے ہم الہمدانی کو کبھی بھی فلسفی نہیں کہہ سکتے، ان کا یہ بیان بھی کچھ
عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے، جس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

لہ واما علم الفلسفة فلم یمنحهم اللہ عز وجل شیئاً منه ولا هیأ طباعهم للعنایة به، یعنی فلسفہ، ملاحظہ
کیجئے، طبقات، ص ۴۵، ۲، ۳ے نفس المصدر، ص ۵۴۔

اس قسم کی اور غلطیاں بھی اس کتاب میں موجود ہیں، لیکن اس پر موجودہ
تحقیق کے نتائج کی روشنی میں تنقید کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس پر تنقیدی نظر
صرف اُن معلومات کی بنا پر ڈالی جا سکتی ہے، جو گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں
علوم اقوام کے بارے میں دنیا کے مختلف مصنفین کو حاصل تھے، خصوصاً ایک مسلمان مصنف
کو جو شہر طلیطلہ کا باشندہ تھا، اور اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا خامیوں سے اس
کتاب کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ کتاب امم قدیمہ کے
علوم کی سب سے پہلی مدون و مرتب تاریخ ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے، یہ صغیر الحجم ہے
لیکن کثیر النفع ہے۔

موجودہ زمانہ کے علماء میں سے جارج سارٹن[1] نے اپنی مشہور تاریخ سائنس میں
اس کتاب کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہونا چاہیئے، رجیس بلاشیر
نے اپنے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ اس کتاب پر ایک طویل مقدمہ شائع کیا ہے،[2] جوشوا فنکل نے
بنو اسرائیل سے متعلق باب کا مطالعہ ایک طویل مضمون میں پیش کیا ہے،[3] راقم الحروف نے
العلم فی الہند، العلم فی الفرس، العلم عند الکلدان پر طویل مطالعے حواشی و تعلیقات کے ساتھ
شائع کئے ہیں، ان کے علاوہ سائنس کے مؤرخ مارٹن پلسنر نے ایک طویل مقالہ اس کتاب
پر لکھا ہے، جس میں قاضی صاعد کی تعریف کی ہے۔[4]

لہ دیکھئے ان کی کتاب Introduction to the History of science جلد اول۔
بالٹیمور ۱۹۵۷ء ص ۷۷۶ ۔ ،،،، ۲ے یہ مقدمہ ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے ۳ے An Eleve-
-nth century source for the History of jewish
scientists in mohammadan lands & the jewish
quarterly review p. 45, 54. میں شائع ہوا ہے

طبقات کے ترجمے اس کا اردو ترجمہ قاضی احمد میاں اختر نے ۱۳۴۶/۱۹۲۸ء میں دار المصنفین، اعظم گڈھ سے شائع کیا تھا[1] اس کا فارسی ترجمہ جلال الدین طہرانی نے طہران سے سنہ ۱۳۱۰ھ شمسی میں شائع کیا[2]، پیرس یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رجیس بلاشیر کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، معلوم نہیں اس کا ترجمہ ہسپانوی زبان میں ہوا ہے یا نہیں،

اس کا بیروت ایڈیشن اطمینان بخش نہیں ہے، اور اس کتاب کے تین نئے اور اہم مخطوطات رام پور، استنبول اور ڈبلن میں پائے گئے ہیں، ان مخطوطات کا علم لوئیس شیخو کو نہیں تھا، ان کی مدد سے طبقات کا ایک اچھا اور صحیح ایڈیشن تیار ہو سکتا ہے، ان کی مدد سے میں طبقات کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، جو انگریزی ترجمہ اور طویل مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ جلد ہی شائع ہوگا۔ انشاءاللہ۔

---

[1] دیکھئے طبقات الامم مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) [2] ملاحظہ کیجئے گاہ نامہ ضمیمہ، مطبع مجلس، صفحات ۱۵۰/۲۳۹،

رومی و اقبال کا تصور انسان

از۔ ڈاکٹر سید نعیم الدین امراوتی،

دیو جانس کلبی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دن دھاڑے ہاتھ میں چراغ لئے انسان کی تلاش کرتے ہوئے ایتھنز میں گھوم رہا تھا، رومی کو بھی انسان کی تلاش مقصود ہے، لیکن انسانوں کی بھیڑ میں حقیقی انسان کب اور کہاں ملتا ہے! ذرا رومی کی اس تلاش کے تیور ملاحظہ کیجئے:-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

یہ انسان کس قسم کا ہے جس کی تلاش میں مشرق و مغرب کے حکماء رہ نورد ہوئے؟ اسکا خالق سے، نیز مخلوق سے اور کائنات سے کیا رشتہ ہے؟

رومی و اقبال نے اپنے اپنے طور پر اس کا جواب دیا ہے۔

رومی کے نزدیک اہلِ دنیا بیشتر اس دنیا کی الجھنوں میں گرفتار، حیوانی سطح پر جیتے ہیں، دنیا کے آخور کے لئے وہ کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ البتہ ایک طبقہ پرہیزگاروں کا ایسا ہے جو آخرت کو پیشِ نظر رکھتا ہے، اور اپنی نجات کا خواہاں ہے، مگر ایسے برگزیدہ لوگ بہت کم ہیں

جو آغاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام کو پیش نظر رکھتے ہیں، یعنی جنھیں اپنے الٰہی منبع و مصدر کا ہمہ وقت احساس ہے، یہ مستِ مئے الٰہی افراد اپنی روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مگن ایک اونچی عالم میں پہنچ گئے ہیں، انھیں نہ اِس دنیا کی دھن ہے نہ اُس دنیا کی فکر، نہ وہ دیوانہ' دنیا ہیں نہ فرزانہ' عقبیٰ، کیا یہ ہر شخص کے بس کی بات ہے؟ رومی اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، ان کی رائے میں ہر انسان میں عیسٰے پنہاں ہے، مگر جب تک درد زہ نہ ہو اس عیسٰے کی ولادت ممکن نہیں جس میں عیسٰے کا ظہور ہو گیا وہی زادہ' ثانی ہے، اور پورا انسان.

بلاشک انسان کی تخلیق بہترین طریقے سے ہوئی ہے. (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم. سورۃ تین) اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے. اور اس کے اندر خدا نے اپنی روح پھونکی ہے. یعنی انسانیت کا چشمہ الوہیت کے منبع سے پھوٹا ہے، مگر انسان کی عظمت بھی قرآن حکیم اس طرح واضح کر دیتا ہے کہ وہی شخص کامران ہے جو صاحبِ ایمان ہے، اور جس کے اعمال صالح ہیں. عزت کا معیار تقوٰے ہے، دولت نہیں (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم. حجرات) انسان اپنی جد وجہد سے تزکیہ' نفس کے ذریعہ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچ سکتا ہے. اور خدا صفت بندہ بن سکتا ہے. پیغمبر صلعم کی ذات اسی قبیل کی تھی، قرآن کریم نے انھیں خلقِ عظیم کا حامل بتایا ہے، (انک لعلیٰ خلقٍ عظیم. ن) مسلمان ان کے اسوۂ حسنہ کو اعلےٰ اخلاق کا اور ان کی شخصیت کو کاملیت کا نمونہ سمجھتے ہیں' خود رسول اللہؐ کا قول ہے. کہ وہ مکارم اخلاق کے فروغ کے لیے مبعوث ہوئے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) اقبال رسولؐ کی جامع جلال وجمال ذات کے عاشق ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسولؐ ہی تھے جنھوں نے دین کی کنجی سے دنیا کا قفل کھولا. اور دنیا میں ذکر دنیا سے بے نیاز زندگی گزارنے کا سبق دیا، یہ بالکل فطری ہے کہ انسان دولت وعزت

چاہے اور شادان و کامراں زندگی گزارنے کے لئے بے چین رہے، لیکن تمام دنیا کے روحانی پیشوا اس پر مصر ہیں، کہ سکون و مسرت دل کا معاملہ ہے. اور مادی و نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے. حواس سے بالا ہو کر جان و روح کی سطح پر ہی صحیح معنوں میں آسودگیِ قلب میسر ہوتی ہے،

قدیم صوفیوں میں بایزید بسطامی پہلے صوفی ہیں جنھوں نے مادی خواہشات سے بے نیاز خدا پرست صوفیوں کو "الکامل التام" کہا ہے، ان کے نزدیک یہ بزرگ ایسے انسان ہیں جن سے معمولی بشری صفات علحدہ ہو چکی ہیں، اور جو خدا سے شدید عشق کرتے ہیں، ایسا شدید کہ بایزید انھیں عرائس اللہ (اللہ کی دلہنیں) کہتے ہیں[1]. انسان کامل کے تصور کی مزید تشریح ابن العربی (۱۲۴۰ھ) صدر الدین قونوی (۱۲۶۳ھ) اور الجیلی (۱۴۱۷ھ) نے کی. بقول ابن العربی انسان آنکھ کی پتلی ہے، جس سے خدا اپنی مخلوقات کو دیکھتا ہے، اور انسان کامل خلیفۂ الٰہی ہے، جس پر دنیا کی حفاظت کا دار ومدار ہے. ابن العربی کے مشہور شاگرد صدر الدین قونوی انسان کامل کو خدا کا عظیم ترین وجودیاتی ثبوت قرار دیتے ہیں. اور اسے لاہوت اور ناسوت کے درمیان ایک رابطہ مانتے ہیں. اولیار اور پیغمبر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں. ان سب کے سرتاج حضرت محمدؐ ہیں (نہاد ایک لیک. فلسفہ صدر الدین قونوی میں انسانی تقدیر اور اخلاق. ریویو آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز. استنبول. جلد ۴. شمارہ ۱، ۲، ۱۹۶۴).

مولانا رومی کی ساری تصانیف اسی انسانِ کامل کی مدح وثنا سے معمور ہیں. رومی اسے واصل حق. بالغ، اور کہیں عاقل، کہیں صاحب دل، اور ولی کہتے ہیں. یہ بزرگ ہستی

[1] روح انسانی کو دلہن قرار دے کر شاہ غلام حسین ایلچپوری نے لگن نامہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جو راقم الحروف نے نوائے ادب میں شائع کی ہے. (جلد ۸. شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۷)

رومی کے نزدیک پیر ہے، یعنی اس کا کام رشد و ہدایت ہے، پیر کے معنی بوڑھے کے بھی ہیں۔ مثنوی کی تیسری جلد میں ان دو معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا رومی نے کہا ہے کہ ایک آدمی خواہ وہ بوڑھا ہو یا نہ ہو۔ واقعی پیر اسوقت کہلاتا ہے جب اس کی ہستی نیست ونابود ہو گئی ہو۔ ایک عیسیٰ بچپن میں بھی پیر تھے۔ لیکن اگر ایک بوڑھے میں بال برابر بھی حیوانی صفات باقی ہوں تو اسے پیر نہیں کہا جاسکتا۔ ہوا و ہوس اور دولت کی لالچ روح کی اسیری کی علامتیں ہیں، ماسوا اللہ سے بے نیازی ہی صحیح معنوں میں فقر و آزادی سے عبارت ہے۔ روحانی طریقت کے تمام سالکین کا قول ہے کہ اہل فقر کی شان ہی نرالی ہے کہ آسمانی سلطنت ان ہی کی ہے، پیر کے پاس نہ مال و متاع ہے نہ اس کی خواہش۔ یہ فقیرانہ رویہ ہی قرب خداوندی کا حقیقی ذریعہ ہے۔ قصہ طوطی وسوداگر کے پردے میں رومی نے فقر و درویشی کی کیفیت بڑے دلکش انداز میں بیان کی ہے۔

قصہ یوں ہے کہ ایک سوداگر ہندوستان کے لئے روانہ ہوتا ہے تو اس کا طوطا اس کے ذریعہ ہندوستانی طوطوں کے لئے ایک پیغام بھجواتا ہے، پیغام سن کر ایک طوطا گر پڑتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرگیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا مالک اُسے پنجرے سے نکال پھینکتا ہے۔ ہندوستان سے واپسی پر تاجر اپنے طوطے کو یہ واقعہ سناتا ہے۔ یہ سن کر تاجر کا طوطا بھی بے جان ہو کر گر پڑتا ہے، اور تاجر اُسے پنجرے سے نکال پھینکتا ہے، لیکن کیا دیکھتا ہے کہ طوطا اڑ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ طوطے نے دم سادھ لیا تھا۔ اور خود پر موت طاری کرلی تھی۔ رومی اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ موت یعنی فقر و درویشی ہی میں حیات مضمر ہے۔ یادِ الٰہی میں مگن، مادی ضروریات سے بے نیاز انسان ہی صحیح معنوں میں زندہ رہتا ہے۔ رومی اکثر ایسے زندہ افراد سے فیضیاب ہو کر نئی روحانی زندگی پانے کی تلقین کرتے ہیں۔ روحانی سطح پر اس طرح زندگی بسر کرنے والا مثالی انسان اس دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن اس دنیا کا نہیں ہوتا۔ محبت الٰہی کے غلبے میں اسے مادی

وجود کا بھی احساس بہت کم ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایسا احساس بالکل فطری ہے۔ چنانچہ اقبال کو بھی اعتراف ہے کہ "صوفی کا حال ایک لمحہ ہے کسی ایسی فرید و وحید یکتا ہستی سے گہرے اتحاد کا جو اُس کی ذات سے ماورا مگر اس کے باوجود اس پر محیط ہو گئی اور جس میں صاحبِ واردات کی شخصیت گویا ایک لحظہ کے لیے کالعدم ہو جاتی ہے"[1]۔ وہ اس دنیا میں ایک معمولی انسان کی زندگی گزارتا ہے، بعض اوقات تھوڑی دولت اور کچھ اقتدار بھی حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ رومی فیہ مافیہ میں واضح کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ مقصد لوگوں سے بظاہر ہم آہنگ ہو کر انھیں دنیائے دنی کے دام سے نکال کر عالم آخرت کے دام میں لانا ہوتا ہے کہ کسی کو اپنے دام میں لانے کے لئے اس کا ہم رنگ ہونا ضروری ہے[2]، مگر درویش کامل کو دولت و شہرت سے واقعی کوئی سروکار نہیں، وہ سماج کا ایک فرد ہے لیکن سماج کی غیر صحت مند لغو پابندیوں سے بے نیاز ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ سماج میں رہ کر سماج کی برائیوں اور بیکار بندھنوں میں اس کے اصلی جوہر کھلتے ہیں۔ رومی پوچھتے ہیں کیا عفت کے کوئی معنی ہیں۔ اگر حیوانی خواہشات کا کوئی موقع نہ ہو؟ درویش وہ ہے جو ہر قسم کی برائی اور حیوانی خواہش کے مقابلے میں پورا اترے۔ اور حرص، خشم، اور نفسانیت پر غالب ہو۔ اور ہوا وہوس سے دور، ہو کر محبت میں مگن رہے۔ خدا کا ایسا عاشق بالآخر خدا کا معشوق بن جاتا ہے۔ اور کون عاشق ہے جو اپنے معشوق کی آرزو پوری نہ کرے؟ اس کی ہر آرزو پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی مرضی کو مرضیٔ حق میں گم کر دیا ہو انسانی سطح پر بھی محبت انسان کو نفسیاتی اعتبار سے صحت مند بناتی ہے۔ اور ماسلو اور ٹولمین جیسے ماہرین نفسیات نفسیاتی طور پر صحت مند انسان ہی کو آئیڈیل انسان مانتے ہیں۔

۱؎ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۸ ۲؎ فیہ مافیہ مرتبہ: فرزند علی ص ۲۵

صوفیوں کو بھی سماج کے عام افراد سے محبت ہوتی ہے، مگر وہ اصل میں عاشقِ الٰہی ہیں۔ عشقِ الٰہی کی کیمیا نے ان کی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ صوفی اب گِل نہیں دل ہے۔ جسم نہیں سراپا جان بن چکا ہے، وہ خود کو ہمیشہ محبوبِ حقیقی کے حضور میں محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے احکام کو خوشی خوشی بجالاتا ہے۔ ایسے عاشق کے لئے معشوق ہی اصل میں موجود ہے۔ جس کے لئے وہ کسی ذہنی دلیل کا محتاج نہیں۔ اس کے علم کا سرچشمہ دل ہے۔ تمام آلائشوں سے پاک، برف کی طرح سفید، ایسا دل جب علم الیقین اور حق الیقین سے گذر کر عین الیقین کی منزل پر آتا ہے تو اس میں روحانی حقایق منعکس ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بڑی عظمت کا حامل ہوتا ہے۔ آدمی وہی ہوتا ہے، جس کی وہ طلب کرتا ہے،

جو یائے ہرچہ ہستی می دانکہ عین آنی

مگر خدا کا عاشق خدا کے بندوں سے بے نیاز نہیں ہوتا، یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق سے پیار کرنے والا اس کی مخلوق سے پیار نہ کرے۔ امیر و غریب کافر و مشرک سب خدا کی مخلوق ہیں۔ اور وہ سب سے پیار کرتا ہے۔ رسول اللہ صلعم رحمت للعالمین تھے۔ ان کی پیروی کرنے والے بھی سب کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگ جزوی طور پر مہربان ہوتے ہیں، رومی ایسے کل سے وابستگی پر زور دیتے ہیں کہ وہی ایک فرد کی جزئیت کو دور کر کے اسے کلیت عطا کرسکتا ہے۔

شخصیت کے مشہور نفسیات داں آل پورٹ کے نزدیک بالغ شخص وہ ہے، جس کی دلچسپیاں خود مختار ہیں۔ اور جو بصیرت، حسن ظرافت اور ایک وحدت آفریں فلسفۂ حیات رکھتا ہے۔ اس کے متوازی ہم روحانی سطح پر اس فرد کو بالغ کہہ سکتے ہیں جس نے اپنے آپ کو یکسوئی سے روحانی و اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا ہے۔

اور جو محبت خداوندی میں مستغرق ہو کر ہر چیز رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے، یہی اس کے تمام اعمال کا تنہا محرک ہے۔ اس کے طفیل اس میں وہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے۔ جو انگور میں شراب دیکھ لیتی ہے۔ یعنی ہر چیز کی تہہ تک اس کی نظر پہنچ جاتی ہے، شخصیت میں اصل چیز نظر ہی ہے، باقی گوشت دفر بہی کی طرح بیکار ہے، صاحبِ نظر صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا ہے۔ اسے نیک نامی اور بدنامی سے کوئی غرض نہیں۔ وہ رابعہ بصری کی طرح جنت و دوزخ کے خیال سے بے نیاز ہو، جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے اس کی عبادت، اس کی حیات اور اس کی ممات — ہر چیز اللہ کے لیے ہے، رومی و اقبال اس محب حق بہر حق کے خلوص اور صدق و صفا کی مدح و ثنا میں اکثر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہی صحیح معنوں میں رومی کے لفظوں میں خدا خو اور اقبال کے لفظوں میں بندۂ مولا صفات ہے۔

اقبال کے نزدیک مولا صفات بننے کے لئے خودی کو عشق کی مدد سے فروغ دے کر اپنی شخصیت کو استوار کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے آئیڈیل انسان کا نمونہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قوت عمل، فکر و بصیرت کے بہترین مجموعہ ذاتِ رسولؐ سے بڑھ کر کونسی ذات ہو سکتی تھی، چنانچہ اقبال نے آنحضرت صلعم کو انسانِ کامل کی حیثیت سے پیش کیا، اور کہا کہ اگر ہم خود کو امتِ محمدیؐ کا رکن سمجھتے ہیں۔ اور محبتِ رسولؐ کے دعوے دار ہیں تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خود کو سیرتِ رسولؐ کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کریں۔ اس طرح فکر و عمل کی صلاحیتوں کو اعلےٰ ترین طریقے سے ابھار کر نیابتِ الٰہی کا مقام حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے بایزید کو اسی قبیل کے عاشقِ رسول کی حیثیت سے پیش کیا، اور شیخ میاں میرؒ کی بھی محبتِ رسول کی بنا پر مدح کی اسی نظم میں بو علی قلندرؒ اور ہجویریؒ کی جوانمردی وآزادہ روی کی بھی تعریف کی ہے۔

بے خوفی و جرأت اعلیٰ انسان کا امتیازی وصف ہے۔ امام حسینؑ اس کی عمدہ مثال ہیں، وہ خود قربان ہو گئے لیکن انھوں نے اپنے اصولوں کو قربان نہیں ہونے دیا۔ اس قسم کے عاشق حق کا شکارِ بلا ہونے کا سوال ہی نہیں، وہ خود بلا شکار واقع ہوا ہے، بقول رومی، ہمہ کس رانہ کار کرد بلا / عاشقاں را بلا شکار بود۔ رومی و اقبال کے مثالی انسان بلا کے دلیر اور قیامت خیز واقع ہوئے ہیں۔

رومی: مرا عاشق چناں باید کہ ہر باری کہ برخیزد — قیامت ہائے پُر آتش ز ہر موئے بر انگیزد

اقبال: اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا — ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستا خیز

اقبال نے ایسے ہی پیرانِ جوان ہمت کے آستانوں کی بوسہ زنی کی تلقین کی ہے، مگر وہ رومی کی طرح کثرت سے اولیا اللہ کا ذکر نہیں کرتے اور نہ انھیں "پیغمبرانِ وقت خویش" قرار دیتے ہیں، رومی نے ایک جگہ کہا ہے:

بگسل از پیغمبرِ ایام خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش

اقبال نے رموزِ بیخودی میں اس شعر کو یوں نقل کیا ہے۔

بگسل از ختم الرسل ایام خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اقبال نے رومی کے محولۂ بالا شعر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے مدحِ پیر کے بجائے مدحِ رسول کا پہلو نکلتا ہے[1]۔ پیغمبر کے برخلاف پیر اکثر اس قدر فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔

ایک صوفی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انھیں معراج نصیب ہوتی تو وہ کبھی دنیا میں واپس نہ آتے۔

---

[1] مثنوی کے انگریزی مترجم آربری نے اپنے ترجمہ (نوٹ۔ ص۔ ۹۰) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ شعر رومی کا ہے یہ نہیں بتایا کہ اقبال نے پہلے مصرعہ میں تصرف کیا ہے۔

اپنے خطبات میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں، کہ پیغمبر اور ولی میں یہی فرق ہے۔ پیغمبر کی تقلید کرتے ہوئے مردِ مومن حرائے دل کی خلوتوں میں الوہی طاقت حاصل کر کے اس دنیا میں آتا ہے کہ یہاں اس سے کام لیتے ہوئے نیابتِ الٰہی کے فرائض انجام دے۔

حرائے دل میں الوہیت محسوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی تحقیق کا ثمر ہو، چنانچہ دونوں مفکرینِ اسلام نے شخصی دینی تجربوں پر زور دیا ہے، اقبال نے اپنے پیر کے مقابلے میں بلیغ تر پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ صاحبِ ایمان کو ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ گویا قرآن اس پر نازل ہوا ہے۔ تقلید کے مقابلے میں تحقیق کے ساتھ ساتھ رومی نے سکر کے مقابلے میں صحو کو اہمیت دی ہے کہ دوسروں کی اصلاح ہوش میں رہ کر ہی کی جا سکتی ہے، انھیں ست عناصر لوگوں سے نفرت اور شیرِ خدا جیسے فعّال افراد سے محبت ہے۔ جو صرف اپنے لیے نہیں جیتے بلکہ جنھیں دوسروں کی بھی فکر رہتی ہے، انھوں نے مثنوی جلد دوم میں ایسے شیر مردوں کی بھی مدح کی ہے۔ جو مظلوموں کی آہ سن کر رحمتِ حق بن کر فوراً مدد کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ (ابیات ۱۹۳۳-۴۴) اقبال بھی باہوش مرشدانِ کامل کے قائل ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "حالتِ صحو جس کا دوسرا نام اسلام ہے، قوانینِ حیات کے عین مطابق ہے۔ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ ایسے آدمی پیدا ہوں جن کی مستقل حالت کیفیتِ صحو ہو"...... ایسے ہی باہوش مردانِ حق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا انحصار کائنات پر نہیں، کائنات کا انحصار ان پر ہے۔ وہ عالمِ اصغر ہیں۔ اور ان میں عالمِ اکبر کی ساری خصوصیات موجود ہیں، یہ دنیا انکی شوخیٔ ادراک کا نتیجہ ہے۔ خدا نے انھیں منتخب کیا ہے۔ اور اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یعنی ایسی امانت (آزادِ شخصیت) سے سرفراز فرمایا ہے جسے زمین و آسمان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(انا عرضنا الامانتہ) انسانِ کامل کی ذات میں دنیا گم ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا میں گم نہیں ہوتا۔ آنحضرتؐ کی دایہ حلیمہؓ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے باہر چلے جانے پر پریشان ہو گئی تھیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رومی کہتے ہیں کہ پیغمبر جیسا انسان دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا ہے جو اس میں گم ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کو عمومی رنگ دیتے ہوئے۔ اقبال نے کہا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مطلب یہ ہے کہ صاحبِ ایمان اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا کر پورے آفاق پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی طرح غالب و کار آفریں کارکشا و کارساز ہے، اس میں قدرتِ کاملہ بھی ہے، اور اعجازِ عمل بھی۔ قدرت و طاقت کا یہ مطلب نہیں کہ اقبالی انسان نطشے کے فوق الانسان کی طرح سراپا جلال ہے، اس کے پاس رفیق دل بھی ہے پہاڑ کے نزدیک بہتے ہوئے چشمے کی طرح مشہور ہے کہ نطشے نرمی و محبت کا قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ معمولی انسانوں کی صفات ہیں۔ وہ حکمرانوں کے اخلاق یعنی اقتدار و شجاعت کا قائل ہے لیکن رومی و اقبال کے انسان قاہری و جلال کے ساتھ دلبری و جمال کے بھی حامل ہیں۔

رومی: در بزم چوں غفارہ گہ رزم ذوالفقار
در شکر ہمچو چشمہ و در صبر خارہ ایم

اقبال: مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

رومی کے شیر مرد اور اقبال کے مرد مومن میں یہ مشترک وصف حیرت انگیز ہے۔ اصل میں اقبالی انسان میں بایزید و جنید کے ساتھ اردشیر کی شوکت بھی ہے۔ وہ بیک وقت افلاطون کا فلسفی بادشاہ، فارابی کا کامل منتظم اور رومی کا پیر واصل ہے۔ وہ خطرات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کسی کے لیے خطرہ بن کر نہیں اور اس کی شفقت عام ہے۔ اس میں خداوند تعالےٰ کی شان غفاری و کریمی نمایاں ہے۔ اس لحاظ سے کہ رومی و اقبال دونوں کے مثالی انسان —

تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق خداوندی اخلاق سے متصف ہیں۔ اس حلقہ کا فرد عام انسانوں کے لئے ایک نمونہ۔ یا رومی و اقبال کے لفظوں میں ایک "میزان" کی حیثیت رکھتا ہے،

رومی: من چو میزانِ خدایم در جہاں
وا نمایم ہر سبک را از گراں

اقبال: قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

مگر رومی کے پیر کے مانند اقبالی انسان کا مقصد تنہا ہدایتِ ملت و اصلاحِ فرد ہی نہیں اسکی سب سے ممتاز خصوصیت "نہایت اندیشہ و کمال جنوں" یعنی فکر و عمل کا انتہائی درجہ ہے، یہ خودی کو عشق سے مستحکم کرنے اور جرأتِ رندانہ سے کام لینے سے عبارت ہے۔ تخلیق و تعمیر ہی کسی انسان کی صلاحیتوں کا سچا اشاریہ ہے۔ مشکل کاموں میں موانع پر غالب آنے میں آزادی کا احساس ہوتا ہے، اور یہی انسانی زندگی کا بہترین لمحہ ہوتا ہے۔ اقبال نے نکلسن کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ "اپنے راستے کے تمام موانع کو دور کر کے خودی کو آزادی نصیب ہوتی ہے، وہ کسی حد تک مختار، کسی حد تک مجبور ہے۔ وہ سب سے آزاد فرد یعنی خدا کے قریب جا کر پوری آزادی حاصل کرتی ہے۔" اقبال مردِ مومن کو تخلیقیت میں خدا کا شریک مانتے ہوئے۔ اس لئے بالخصوص قوتِ ایجاد اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس حد تک جاتے ہیں کہ کارِ نادر اگر گناہ بھی ہو تو اسے ثواب سمجھتے ہیں!

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبال کا انسان عام صوفیوں کی طرح اندیشہ ہائے افلاکی میں ہمہ وقت مستغرق نہیں، وہ خلوت میں اپنی توانائیاں مرتکز کرتا ہے۔ اور جلوت میں آ کر ان سے کام لیتا ہے۔ وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ شمعِ محفل کی طرح تنہا بھی ہے۔ اور سب کا رفیق بھی، وہ بہرحال اسی دنیا کا عملی انسان ہے۔ اور معاشرے میں زبردست تبدیلی لانا چاہتا ہے، ساتھ ہی

تسخیرِ فطرت اور ایجادِ اشیاء کا قائل ہے۔ مگر یہ مثال اُسی وقت نمایاں ہوتی ہے جب سیاسی و ذہنی آزادی نصیب ہو۔ انسانی شخصیت کی نشو و نما کے لئے آزادی ضروری ہے۔ آزادی ہی میں خودداری، خود اعتمادی جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ آزادی کا عاشق نہ کسی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ نہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے سامنے سر جھکائیں۔ وہ دوسروں کی خدمت کرنا لازمۂ انسانیت سمجھتا ہے لیکن اس کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی کو زحمتِ خدمت دے۔ حضرت عمرؓ گھر گھر جاکر بیواؤں کی خدمت کرتے تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ہاتھ سے چابک گر گیا تو انھوں نے غلام سے چابک اٹھانے کے لئے نہیں کہا۔ بلکہ خود اٹھا لیا۔ آزادی پسند انسان کو دوسری قوموں کے شعار کی غلامانہ متابعت یا تقلید منظور نہیں، وہ اپنی روایات و معتقدات میں راسخ ہوتا ہے۔ اپنی ثقافت کی سرزمین پر اس کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہوتے ہیں اگرچہ اس پر دیارِ غیر سے ہوائیں بھی چلتی رہتی ہیں۔ وہ آئینِ الٰہی کا پابند ہے۔ اور اس کی روشنی میں شاہراہِ حیات پر چلتا ہے۔ لیکن اس نے دینی اصولوں کو اپنے باطن میں جذب کر لیا ہے۔ وہ اس کا جزو بن چکے ہیں۔ اس کے لئے "توبہ کرے گا۔ اور "توبہ نہیں کرے گا" کی آواز باہر سے نہیں آتی۔ اسکے درونِ قلب سے آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر نصب العین اس کے باطن میں سرایت کر گیا ہے اور اس کے تمام جسمانی، دماغی اور روحانی قویٰ ایک جاندار کل کا جزو ہیں۔ بقول رومی "وہ شکر کے مانند میٹھا نہیں، وہ خود شکر بن چکا ہے۔ اور اب مٹھاس اس سے کبھی علٰحدہ نہیں ہو سکتی" اسطرح کے سراپا شیریں انسان کا مخصوص مشن لوگوں کو روحانی طور پر زندہ و تابندہ رکھنا اور ان میں صفاتِ خداوندی پیدا کرنا ہے۔ اس نے خود کو اخلاقی رذائل سے پاک و صاف کر کے گل کو دل میں اور جسم کو جان میں تبدیل کر لیا ہے۔ اور نئی زندگی پائی ہے۔ یعنی بقول رومی و اقبال وہ زادۂ ثانی سے پہلے زمینی تھا تو اب آسمانی ہے۔ حضرت علیؓ ایسے ہی آسمانی، زادۂ ثانی تھے

انھوں نے اپنی گل یعنی نفس کو پوری طرح مسخر کر لیا تھا۔ اور اس لئے ابو تراب کہلاتے تھے۔ ایسے علی صفت انسان کا علم ظاہری اور سطحی نہیں ہوتا۔ وہ ان کے دل و شخصیت کا جزو ہوتا ہے۔ رومی نے یہ جو کہا ہے کہ:

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

۔۔۔۔ تو اس کا یہی مطلب ہے۔ اور اقبال اس خیال کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اس شعر کو ایک سے زیادہ جگہ اپنے کلام میں نقل کیا ہے۔ بلکہ ایک مقام پر تصریح بھی کی ہے کہ اپنے علم کو سوزِ دل سے مکمل کرنا ضروری ہے۔ عارف اپنی نشو و نما کے لیے خارجی ذرائع کا نہیں، باطنی صلاحیتوں کا مرہونِ احسان ہے۔ بقول رومی وہ اپنی غذا اپنے باطن سے حاصل کرتا ہے۔ اور اقبال کہتے ہیں "لیکن اگر گرد و پیش کی قوتیں اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اعماقِ وجود میں اس سے بھی ایک وسیع تر عالم تیار کرے جہاں اس کو لاانتہا مسرت اور فیضانِ خاطر کے نئے نئے سرچشمے مل جاتے ہیں۔[۵] دراصل اس کا دل ہمیشہ مسرور رہتا ہے۔ اُسے غضب کا سکونِ قلبی حاصل ہے خودی کے فروغ کے سلسلے میں وہ صبر و ضبط کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ معمولی انسان ذرا سے نقصان سے پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر ایک صاحبِ دل کے سکونِ قلبی کی انتہا نہیں۔ وہ کسی مادی بحران سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ خدا ہی فاعلِ حقیقی ہے، ہمارا کام صرف اس کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چلنا اور چلتے رہنا ہے۔ رومی و اقبال جیسے صوفیوں کو یقین ہے کہ رات کے بعد دن آکر رہے گا۔ وہ غم کے نہیں خوشی اور رجائیت کے مبلغ ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

ہر حال میں میرا دلِ آزاد ہے خرسند　　کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

---

[۵] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۱

اور رومی کہتے ہیں :- چو غلام آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

(کلیاتِ شمس جزو سوم / بیت نمبر ۱۶۹۶۶)

ان کا دل مسرت سے اس قدر لبریز ہے کہ وہ مرغابی بننے کے لیے چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سہی ان کو دل تنگی نصیب ہو۔ ایسی خوش دلی و یکسوئی قلب کی وجہ یہ ہے کہ بقولِ رومی، عارف کو دو منزل ہی آنکھیں ملی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ انتشارِ خیالی کا شکار نہیں ہوتا اور یکسوئی سے رواں دواں اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو قرآن کی زبان میں ذاتِ باری ہے۔ (وان الی ربک المنتہیٰ)

رومی کے مقابلے میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ منزلِ کبریا کا اقبالی راہی خدا بین ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں بین بھی ہے۔ اور تسخیرِ فطرت کا قائل ہے۔ رومی کے یہاں زیادہ زور خدا بین بننے پر ہے مگر اقبالی درویش نائبِ حق بن کر اس دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کی ہمت رکھتا ہے وہ واقعات و حادثات کا مخلوق نہیں، خالق ہے جیسا کہ اقبال نے لندن میں اپنے ایک لکچر میں کہا ہے :-

"انسان کو شعور اور شخصیت ملی ہے۔ جو شمس و قمر کو نہیں ملی۔ ذی روح اور ذی شخصیت ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو اپنے فکر و عمل سے آباد کرے۔ اپنی ندرتِ فکر و عمل سے اس دنیا میں ہلچل ڈالنے والی ہستی موت سے بھی نہیں مرتی۔"

عہدِ اسلامی میں تعلیمی و علمی سرگرمیوں پر ایک نظر

از جناب حافظ محمد احمد غازی، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے پیغمبرانہ فرائض بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں تک پہنچانے اور ان کا تزکیہ نفس کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کا کام یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کو کتاب اللہ اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے، یہ فرائضِ سہ گانہ قرآن مجید میں بار بار دہرائے گئے ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم دینا نبی کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ ہے، پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت تمام کائنات کے لئے ہے اس لیے لامحالہ آپ کی تعلیم بھی تمام کائنات کے لیے ہوگی، یہ بات کی تعلیم حکمت اور تعلیم کتاب پوری دنیا کیلئے تھی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہئے تعلیمی دنیا کے لیے ایک بڑا انقلاب آفریں پیام تھا، جو رحمۃ للعالمین ہی کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچ سکتا تھا،

اسلام سے قبل دنیا میں جہاں اور بہت سی اجارہ داریاں قائم تھیں، وہاں تعلیم اور بالخصوص مذہبی تعلیم پر بڑی افسوسناک اجارہ داری بھی قائم تھی، عرب میں جب اسلام آیا تو خود قبیلۂ قریش میں جو تمام عرب پر مذہبی اقتدار رکھتا تھا، بقول بلاذری سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1]، عرب سے باہر کے متمدن ممالک میں بھی عام آدمی کو لکھنے پڑھنے کی اجازت

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۷۷

نہ تھی۔ سینٹ پال نے مسیحیت کی ترویج کی تو اس نظام کے گرجاؤں میں ایک عام آدمی کا بار پانا آسان نہ تھا، ہندوؤں کے طبقاتی نظام میں اگر کسی غریب شودر کے کان میں بلا ارادہ بھی وید کا کوئی اشلوک پڑجاتا تو اس بے گناہ کی سزا یہ ہوتی کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا جاتا۔ رحمۃ للعلمین نے جہاں اور ساری اجارہ داریوں کو ختم کیا، وہاں دنیا کے تمام انسانوں میں خواہ وہ کالے گورے، عورت مرد، بچے بڑے ہوں سب ہی کو کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کی ہدایت دی، قرآن مجید نے ہر شخص کو نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرنے کی دعوت دی، بلکہ ہر شخص کو فرض قرار دیا کہ وہ علم حاصل کر کے انفس وآفاق پر غور کرے، نظامِ فلکیات، نظامِ شب وروز، باد و باراں، بحر و دریا، صحرا و کوہستان، غرض کون سی چیز ہے، جس کا مطالعہ کرنے اور اسکی پوشیدہ حکمتوں کا پتہ چلانے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے، قرآن نے صاف طور پر اعلان کیا کہ

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر: ۲۸)

خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں۔ جو صاحب علم ہیں۔

قرآن نے واضح طور پر کہا کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں، جو سمجھ رکھتے ہیں، اس میں علم و عقل، سمجھ، فہم اور اس کے مترادفات بار بار استعمال ہوئے ہیں شاید اسی لیے حصول علم کی خاطر مسلمانوں کو دور دراز مقامات تک سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہؐ نے ان اہل علم پر سخت وعید فرمائی ہے جو اپنے علم کو اپنی ذات تک محدود کیے بیٹھے رہتے ہیں، اور خلق خدا کو اس سے مستفید نہیں کرتے، ایک جگہ ایسے عالم کو جو ضرورت مندوں کو اپنے علم سے مستفید نہ کرے گونگا شیطان قرار دیا گیا ہے، واضح طور پر یہ حکم ہے۔

ولا تمنع العلم اھلہ فتاثم

یعنی علم سے کسی کو نہ روکو ورنہ گنہگار ہو گے!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ من اشر الناس عند اللہ منزلۃً یوم القیامۃ عالم لا ینتفع بہ

(الدارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۸۹)

قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالٰے کے نزدیک سب سے بدتر وہ عالم ہوگا جس کے علم سے لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

مزید کہا گیا ہے۔

مثل علم لا ینفع کمثل کنز لا ینفق فی سبیل اللہ

(احمد والدارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۹۲)

اُس علم کی مثال جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، اس خزانہ کی سی ہے، جس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔

اور وہ خزانہ جس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے اس کی کیفیت خود اللہ تعالٰے نے یوں بیان کی۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمٰی علیھا فی نار جھنم فتکوٰی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھٰذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔

([illegible] التوبہ ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو، ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ میں یہ سونا اور چاندی دہکایا جائے گا، اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں پہلو اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے بار بار نصیحت فرمائی کہ اللہ سے ایسا علم مانگو جو نفع بھی پہونچائے
خود بھی حضورؐ جو دعائیں مانگا کرتے تھے اُن میں یہ دعا بھی ہوتی تھی۔

اللّٰھم انی اسئلک علماً	اے اللہ میں آپ سے علم نافع طلب
نافعاً (جامع بیان العلم وفضلہ ص۳۰)	کرتا ہوں۔
اللّٰھم انی اعوذ بک من	اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ
علم لا ینفع الخ (ابوداؤد وابن ماجہ)	مانگتا ہوں جو بے فائدہ ہو نفع نہ دے۔

بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الدعوات ص۵۵)

اسلام میں جہاں طلب علم کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ وہاں اس فرضیت کی تفصیلات بھی واضح کر دی گئی ہیں۔ حصول علم کا ایک درجہ فرض عین یعنی ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے جب کہ دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے، جو پوری ملت پر اجتماعی طور پر فرض کیا گیا ہے، اور اگر کچھ لوگ بھی اسکو پورا کردیں تو پوری قوم بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ شریعت کا بنیادی اور ضروری علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے اور ایک اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو اسلامی احکام کا ضروری اور بنیادی علم حاصل کرنے میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص یہ بنیادی تعلیم حاصل نہ کرے تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر اس کام کے لیے ایک شخص کو گشتی افسر مقرر کیا تھا۔ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لئے یہ فرض عین ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے بارے میں تمام ضروری علم رکھتا ہو، مثلاً ایک تاجر کے لئے لازمی ہو کہ اسلامی اصول تجارت اور اس کے دوسرے طریقوں سے اچھی طرح آگاہ ہو اور ایک ڈاکٹر کا فرض ہوگا کہ فن طب کے بارے میں تمام ضروری علم حاصل کرے، اس کے علاوہ جتنے دوسرے علوم وفنون ہیں حتیٰ کہ خود اسلامی شریعت کا تفصیلی علم بھی فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے،

اگر معاشرہ میں کچھ لوگ یہ علم رکھنے والے موجود ہیں تو ٹھیک ورنہ پورا معاشرہ قابل مواخذہ ہوگا، مسلم مفکرین نے ان تمام علوم سے بحث کی ہے جو فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں، امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ نے ان میں سائنس، انجینئرنگ، اور صنعت وحرفت کو بھی شامل کیا ہے۔
ان کا خیال ہے کہ یہ فنون جہاں سے بھی حاصل ہو سکیں حاصل کرنے چاہییں، خود رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ پوری رواداری اور بے تعصبی کے ساتھ جو مفید چیز جہاں سے ملی، اخذ کر لی گئی۔ لیکن اس افادیت کا تعین بہرحال قانون شریعت ہی کی روشنی میں کرنا چاہیئے، اس مضمون کی بے شمار احادیث، کتب حدیث میں موجود ہیں، مثلاً

الحکمۃ ضالۃ المومن انی	حکمت اور دانائی کی بات مسلمان ہی
وجدھا فھو احق بھا	کی گم شدہ پونجی ہے، جہاں بھی اور
(جامع الترمذی کتاب العلم ص۲۲۴)	جیسے بھی اس کو ملتی ہے وہ اس کا زیادہ
	حقدار ہے۔

ایک اور جگہ ہے،

العلم ضالۃ المومن حیثما	علم مومن ہی کی گم شدہ پونجی ہے جہاں
وجدہ اخذہ	ملتی ہے لے لیتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا۔

العلم ضالۃ المومن فخذوہ	علم مومن ہی کی گم شدہ پونجی ہے اسلئے
ولو من المشرکین ولا یانف	اس کو حاصل کرو، چاہے مشرکین
احدکم ان یاخذ الحکمۃ	ہی سے حاصل کرو اور تم میں سے کوئی

ممن سمعها منه۔ (جامع بیان العلم وفضلہ ص۱۰۱)	شخص ہر اُس شخص سے جس سے تم حکمت کی کوئی بات سنو قبول کرنے میں عار نہ محسوس کرے۔

خود رسول اللہؐ کے مبارک عہد میں نوجوان صحابہ کرامؓ نے مکہ کے مشرک قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ خود کاتب وحی اور صحابہ کرامؓ میں علوم قرآن کے نمایاں ترین عالم حضرت زیدؓ بن ثابت نے انہی مشرکین سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔[1]

علمی مشاغل اور مذاکروں کو حضورؐ نے عام عبادت سے بڑھ کر درجہ دیا، یہ تو مشہور حدیث ہے کہ شیطان کے لیے ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔[2] یہ بھی بہت مشہور حدیث ہے کہ ایک روز رسول اللہؐ مسجد نبویؐ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہؓ کرام کے دو گروہ الگ الگ دو محفلیں منعقد کئے بیٹھے ہیں، ایک محفل میں ذکر اللہ اور تسبیح و مناجات ہو رہی تھی اور دوسری محفل میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا، حضورؐ نے دونوں کو دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا، دونوں اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن افضل اور برتر درجہ ان لوگوں کا ہے، جو علمی مذاکرہ کر رہے ہیں، اور حضورؐ یہ فرماتے ہوئے کہ انما بعثت معلماً کہ میں بھی تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں، علمی مذاکرہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔[3] ایک اور موقع پر بھی یہی صورت تھی تو آپ پھر علمی محفل کے ساتھ شامل ہو گئے، اور فرمایا بھذا امرت مجھے بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تمام رات علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے رہے، جب صبح کا وقت قریب ہوا تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے یاد دلایا کہ امیر المومنین

[1] التنبیہ والاشراف مسعودی ص۲۸۳ [2] ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۵،

[3] دارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۶ و جامع بیان العلم ابن عبد البر ص۲۵

نماز کا وقت ہونے والا ہے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا یہ بھی نماز ہی ہے، جس میں ہم اس وقت مصروف ہیں،

اس میں شک نہیں حصول علم میں سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ علم شریعت کا ہے، لیکن دوسرے مفید علوم و فنون کی تحصیل بھی رضائے خداوندی سے خالی نہیں، خود قرآن مجید میں بار بار کائنات اور مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی، متعدد احادیث میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے۔

خیر عباد اللہ الذین یراعون الشمس والقمر والنجوم والاھلۃ لذکر اللہ۔	وہ لوگ اللہ کے بہترین بندے ہیں جو چاند، سورج، ستاروں اور رویت ہلال وغیرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس سے اللہ کی قدرت انہیں یاد آتی ہے، یا اس سے ذکر اللہ کے لیے اوقات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

اس طرح کے ارشادات دوسرے علوم و فنون کے بارے میں بھی ہیں:۔

تعلیم کی یہ اہمیت جاننے کے بعد اب ہمیں مختصر طور پر دیکھنا چاہیے کہ پیغمبر تعلیم نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے عملاً کیا کیا اقدامات کئے اور کیا کیا تدابیر اختیار کیں، ہجرت سے قبل کا زمانہ اگرچہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا، اور مسلمانوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ امن نصیب تھا، اور نہ اطمینان اور نہ مکہ میں کوئی اجتماعی نظم قائم ہو سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہؐ نے خفیہ طور پر مشہور صحابی حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ کے گھر کو

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۸

اسلام کی پہلی درس گاہ کے طور پر استعمال کیا، یہیں حضور رسالت مآبؐ صحابہ کو قرآن مجید اور اسلام کی تعلیم دیتے، یہیں لوگ نمازیں ادا کرتے اور یہیں قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور رکوعوں پر مشتمل کتابچے تیار کیے جاتے تھے، رسول اللہؐ کے حکم سے تعلیم یافتہ صحابہ دارارقم کے باہر بھی لوگوں کے گھروں میں جاکر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے[1]، چنانچہ مشہور واقعہ ہے، کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے اُس وقت ان کی بہن کے گھر میں مشہور صحابی حضرت خبابؓ بن الارت، حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے، اور ان کے پاس ایک کتابچہ میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی موجود تھی، جس کو پڑھ کر حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے[2] جب مدینہ میں اسلام کا آغاز ہوا تو رسول اللہؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت مصعب بن عمیر کو مسلمانان مدینہ کی تعلیم کے لیے مدینہ بھیجا، مصعبؓ بن عمیر پہلے مسلمان تھے، جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گئے[3]، ہجرت سے قبل حضورؐ نے مدینہ کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں جن بارہ نقیبوں کا تقرر کیا، ان میں بھی اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کی صفت زیادہ نمایاں تھی ان میں متعدد وہ اصحاب تھے، جو زمانہ جاہلیت میں کامل یعنی علامہ اور ہر فن مولا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، ہجرت کے بعد جب مدینہ میں اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو تمام داخلی اور خارجی خطرات اور ہنگاموں کے باوجود رسول اللہؐ نے تعلیم کی طرف اولین توجہ مبذول فرمائی، مسجد نبویؐ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلام کی پہلی باقاعدہ درس گاہ صفہ کا قیام بھی عمل میں آیا، یہ مسجد نبویؐ میں ایک احاطہ تھا، جو مقیم طلبہ کے لیے اقامت گاہ اور درس گاہ دونوں کا کام دیتا تھا، اس درس گاہ کے نگران اعلیٰ خود رسول اللہؐ تھے، آپ کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں حضرت عبادہؓ بن الصامت، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ،

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۹۰ [2] ایضاً [3] طبقات ابن سعد قسم اول جزو ثالث، ص ۸۳

حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت سعیدؓ بن العاص کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں، ان بزرگوں میں کچھ کے ذمہ قرآن مجید کی تعلیم، کچھ کے ذمہ فقہ کی اور کچھ کے ذمہ لکھنا پڑھنا سکھانا تھا حضرت عبادہ بن الصامتؓ لکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتے تھے، بچوں کو لکھنا سکھانے کے لئے الگ مکتب بھی قائم کیے گئے، جہاں وہ تختیوں پر لکھنے کی مشق کیا کرتے تھے،

(تفصیل کے لیے دیکھئے، شمائل ترمذی بخاری باب سریۂ بیر معونہ، زرقانی، مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۷، اور رسالہ سیوطی در اصحاب صفہ)

صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ تعلیم پاتے تھے بلکہ مدینہ میں رہنے والے لوگ بھی بلا لحاظ عمر وہاں علم سیکھتے تھے، مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ان اصحاب کے اخراجات عموماً سرکاری مصارف سے پورے ہوتے تھے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ کی ننھی سی ریاست مسلسل ہنگامی دور سے گزر رہی تھی، بعض اوقات سرکاری وسائل سے یہ اخراجات پورے نہ ہو پاتے تو اللہ کے غیور بندے کسی پر ظاہر نہ کرتے، اور جو کچھ گزرتی، صبر و شکر سے جھیل لیتے، حضرت ابو ہریرہؓ نے جو فضلائے مدینہ کے سرخیل ہیں اپنی اس تنگدستی کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں، جو صفہ میں قیام کے دوران ان پر گزریں، عموماً مختلف صحابہ کے ہاں رات کے کھانے پر دعوتیں ہوا کرتی تھیں، لوگ حسب استطاعت ایک ایک دو دو اصحابِ صفہ کو کھانے پر بلا لیتے تھے، اس معاملہ میں رئیس خزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ عموماً سب سے بازی لے جاتے تھے، وہ ایک وقت میں اسّی اسّی سے کم لوگوں کو نہ بلاتے تھے[1]، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ۹۰ اور ۱۰۰ کے قریب رہتی تھی[2]، ان مقیم طلبہ کے علاوہ بیرون مدینہ سے مختلف لوگ آتے تھے، اور مختصر عرصہ قیام کر کے دین کا ضروری

[1] زرقانی ج ۱ ص ۱۰۔ ۲۷ [2] حافظ سیوطی نے اصحاب صفہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں سو آدمیوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیے ہیں،

علم حاصل کرتے تھے۔

صفہ میں دی جانے والی تعلیم کی بنیاد، اساس اور روح قرآن مجید تھا، صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید ہی کے مدرسہ میں پڑھا، قرآن مجید ہی سے تربیت پائی، اور قرآن مجید ہی ان کے سارے علم کی اصل تھا، خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کو تمام علوم کا جامع بتایا گیا ہے۔ ما فرطنا فی الکتٰب من شئی، ہم نے اس میں کسی چیز کی کمی نہ رہنے دی، ونزلنا علیک الکتاب تبیانًا لکل شئی، ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے، جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے، اسی مضمون کو حضورؐ نے یوں بیان فرمایا۔

تعلموا وعلموہ الناس تعلموا القرآن وعلموہ الناس۔	علم حاصل کرو اور اس کو سکھاؤ قرآن پڑھو اور اسکو پڑھاؤ۔

(دارمی، دارقطنی ص۵۹)

یعنی انسانیت کے وہ گر اس میں بتا دیئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان ہر چیز کو پرکھ سکتا ہے۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن میں علم کے بنیادی اصول موجود ہیں، امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ سارا اسلامی لٹریچر رسول اللہؐ کی سیرت اور سنت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تشریح ہے اور خود سیرت و سنت قرآن مجید کی تشریح ہے، امام شافعیؒ کی اس رائے کی صداقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے مختلف مطالب کا ادراک کرنے کے لیے امت مسلمہ نے جو جو علوم و فنون ایجاد کیے ان کی تعداد قاضی ابو بکر بن العربیؒ نے ساڑھے چار سو ستر تک بتلائی [illegible] قرآن [illegible] قرآن پڑھیں گا [illegible] حاصل ہوئے ہونگے جو اصحاب [illegible] رسول [illegible] قرآن مجید کی

اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے وہ دس دس آیات پڑھتے تھے، اور جب تک معانی و مطالب ذہن نشین نہ ہو جاتے تھے آگے نہ بڑھتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ کے خصوصی مطالعہ پر چودہ سال صرف کئے۔[1]

اس زمانہ میں درسی کتابوں کا رواج نہ تھا، قرآن مجید اور سنت رسولؐ ہی بنیادی درسی کتابیں تھیں، ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر رسائل لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب رسول اللہؐ نے حضرت عمرو بن حزمؓ انصاری کو فقہ کی تعلیم کے لیے نجران بھیجا تو ان کیلئے ایک کتاب لکھوائی جس میں فرائض، سنن اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام درج تھے۔[2] اس طرح کا ایک مجموعہ حضرت علیؓ کے بھی پاس تھا، عہد نبویؐ میں اس طرح کے مجموعوں اور ان کی درس و تدریس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جن کی کچھ تفصیل مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب تدوین حدیث[3] اور ترکی کے ڈاکٹر فواد سیزگین کی جرمن تصنیف اسلامی علمی ورثہ کی تاریخ میں مل سکتی ہے بعض دوسرے علوم و فنون میں بھی کتابیں لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے، آخر زمانہ میں زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہؐ نے جو ہدایتیں دی تھیں اُن کو باضابطہ لکھ کر مرتب کر لیا گیا تھا اور یہ حضرت عمرؓ کے خاندان میں محفوظ رہا۔ اور وہیں سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس کی نقل لی تھی۔[4]

فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے جو خطبہ دیا تھا، اس کو یمن کے ایک صحابی ابو شاہؓ نے باقاعدہ لکھ لیا تھا۔ (ابو داؤد، کتاب المناسک، باب تحریم مکہ، بخاری: کتاب العلم) حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہؐ سے جو کچھ سنتے تھے بیٹھکر لکھتے جاتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۹۹)، رسول اللہؐ کے مختلف فرامین کو بھی صحابہ کرامؓ نے قلمبند کر لیا تھا جو آگے

---

[1] موطا امام مالک [2] استیعاب، بتذکرہ عمرو بن حزم انصاریؓ [3] تدوین حدیث ص ۱۵ [4] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمہ۔

چل کر ان سے شرعی مسائل مستنبط ہوسکیں۔

حضورؐ کے زمانہ میں طلبہ کو باقاعدہ سند جاری کرنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، لیکن مختلف صحابہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ مختلف علوم میں ان کی مہارت کو زبانی سند دربارِ رسالت سے جاری ہوئی، اور حضورؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان صحابہ سے ان کے اختصاصی علوم میں رجوع کریں، مثلاً حضورؐ نے حضرت ابی بن کعبؓ[1] اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرآن فہمی کی گواہی دی[2]، حضرت عمرؓ کے مجموعی علم کی تعریف کی[3]، علم فرائض و علی ہذا علم حساب میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مہارت اور عدالتی امور میں حضرت علیؓ کی صلاحیتوں کو سراہا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ حلال و حرام کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں[4]۔ اس طرح کی ایک تقریر ایک بار حضرت عمرؓ نے بھی کی تھی اور مختلف صحابہ کی جو علمی فضیلت تھی اسکو بیان کیا تھا، صرف اتنا اضافہ تھا کہ مالیات کی بابت معلوم کرنا ہو تو مجھ سے پوچھو،

خالص دینی علوم کے علاوہ حضورؐ نے اپنے زمانہ کے رائج الوقت مفید علوم کے سیکھنے کی نہ صرف ترغیب دلائی بلکہ خود بھی اس کا اہتمام فرمایا، حضورؐ کا حکم تھا کہ نشانہ بازی، پیراکی، حساب، علم میراث، طب، علم ہیئت، و فلکیات، علم انساب اور علم تجوید کی تعلیم ضرور دی جائے[5]۔ نشانہ بازی کے مقابلے خود حضورؐ اپنی نگرانی میں کرایا کرتے تھے، نیز ایک حدیث ہے۔

علموا ابناءکم السباحة　　اپنے بچوں کو تیرنا اور نشانہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل [2] صحیح مسلم، باب من فضائل عبد اللہ بن مسعود [3] مشکوٰۃ باب مناقب عمرؓ [4] مشکوٰۃ باب مناقب عشرہ ص ۵۸۵ [5] سیوطی نے جمع الجوامع میں ہر عنوان سے اسکو ذکر کیا ہے۔ ص ۲۲۰ و جامع بیان العلم ص ۱۰

والرمایۃ - (جامع صغیر سیوطی دوم ص ۱۲۵ بحوالہ بیہقی شعب الایمان)　　بازی سکھاؤ۔

ان چیزوں کے لیے جس چیز کی ضرورت پڑتی، حضورؐ اس کے سیکھنے کے لیے کسی مناسب آدمی کو مقرر کر دیتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ جنھوں نے صغر سنی میں علم حاصل کیا اور جنگ بدر کے مشرک قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ نہایت ذہین اور خوش خط تھے، علم حساب اور فرائض میں آپ کی مہارت کو خود سرورِ کونینؐ نے سراہا تھا، حضرت زیدؓ رسول اللہؐ کے گویا کاتب خاص تھے۔ معاہدات کا لکھنا اور دوسری رازدارانہ خط و کتابت آپ کے سپرد تھی، اپنے شوق سے مدینہ آنے جانے والے مسافروں سے فارسی اور حبشی زبانیں سیکھیں، ایک مرحلہ پر جب یہ محسوس ہوا کہ عبرانی جاننے والا کوئی قابل اعتماد شخص ہونا چاہیے، تو حضورؐ نے انکو عبرانی بھی سیکھنے کا حکم دیا، حضرت زید بن ثابتؓ نے چند ہفتوں کی قلیل مدت میں عبرانی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی[1]۔

مدینہ منورہ میں صفہ واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں موجود تھیں۔ اور قرب و جوار کے لیے درس گاہوں کا کام انجام دیتی تھیں، مدینہ سے چند میل دور قبا کی مشہور مسجد میں بھی ایک درسگاہ قائم تھی، اور رسول اللہؐ وقتاً فوقتاً اسکا معائنہ کرنے بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے[2]، ان سب درسگاہوں کا حضورؐ معائنہ فرماتے رہتے تھے، اور اگر کوئی نامناسب بات دیکھتے تو فوراً منع کر دیتے تھے[3]۔ دور دراز کے مقامات پر بھی جوں جوں اسلام پھیلتا جاتا تھا حضورؐ معلمین مقرر فرماتے جاتے تھے مختلف قبائل کے وفود اگر اسلام قبول کرتے تو واپسی میں ان کے ہمراہ کسی نہ کسی تربیت یافتہ

---

[1] التنبیہ والاشراف، مسعودی ص ۲۸۳ [2] جامع بیان العلم ص ۹ [3] جامع الترمذی باب العلم

اور تجربہ کار صحابی کو بھیج دیا جاتا تھا، ایک بار نجد کے علاقہ میں تعلیم دینے کے لیے ستر اہل علم صحابہ کی ایک جماعت بھیجی گئی، جن کو مشرکین نے بیر معونہ کے مقام پر دھوکہ سے شہید کر دیا[۱]
ان اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کا حضورؐ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھتے اور دشمنوں کو بد دعا دیتے رہے۔[۲] بعض اوقات کسی کو گورنر یا حاکم مقرر کرتے تو تعلیم کی ذمہ داریاں بھی ذاتی طور پر اس کے سپرد کی جاتی تھیں، عمرو بن حزمؓ کو جب یمن کا گورنر مقرر کیا تو ان کو خاص طور پر تاکید کی کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست اور نگرانی کریں، طبری کے بیان کے مطابق یمن میں رسول اللہؐ نے ایک ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع میں دورہ کرکے وہاں کی تعلیمات کی نگرانی کرتا رہے۔[۳] ممکن ہے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ناظر تعلیمات مقرر کئے گئے ہوں۔

غزوۂ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کرکے رہائی حاصل نہ کر سکتے تھے، ان کے لیے رسول اللہؐ نے یہ حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا، (مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۴۶، طبقات ابن سعد ص ۱۴)

باہر سے جو مہاجر آتے رسول اللہؐ ان کو انصار کے حوالہ کر دیتے کہ وہ مہمانداری کے ساتھ ان کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں، وفد عبد القیس اور وفد بنی تمیم، مدینہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ (مسند ج ۳ ص ۴۳۲، اسد الغابہ تذکرۂ عمرو بن ہثیم)

رسول اللہؐ اپنے عہد کے امراء و عمال کو کتاب اور سنت کی تعلیم دینے کا حکم دیتے اور اس کو ان کے لیے فرض قرار دیتے۔ (استیعاب ابن عبد البر تذکرۂ معاذ بن جبلؓ)

۱؎ صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنۃ للشہید ۲؎ مشکوٰۃ باب القنوت ۳؎ تاریخ طبری ص ۱۸۵۲ احوال ۱۰ھ

رسول اللہؐ نے حضرت عبد اللہ بن سعید بن العاصؓ کو خاص طور سے حکم دیا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ (اسد الغابہ تذکرہ حضرت عبد اللہ بن سعیدؓ)

علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں تقریباً چالیس[۱] ایسی مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں موجود تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا،

رسول اللہؐ نے خواتین کی تعلیم کا بھی پورا پورا بندوبست کیا، ہفتہ میں ایک روز آپ نے خواتین کی خصوصی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا، جس میں آپ خود ان کے اجتماع میں جاکر ان کو تعلیم دیتے تھے[۱]، خود ازواج مطہراتؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی خصوصی نگرانی میں وہ دینی تعلیم و تربیت دی جو اسلامی پردہ کے احکام کی وجہ سے خود حضورؐ دوسری عام خواتین کو نہیں دے سکتے تھے۔

علامہ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم ص ۴۶ پر ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنی لونڈی کو اچھی تعلیم و تربیت دی، اور اسکو آزاد کرکے شادی کر لی تو اسے دوگنا ثواب ملے گا،

حضورؐ کے بعد خواتین کی تعلیم کا یہ سلسلہ ازواج مطہرات نے جاری رکھا، ازواج مطہرات میں علمی اعتبار سے حضرت عائشہؓ کو عظیم رتبہ حاصل تھا، ان کو قرآن، سنت، فقہ، ادب، شاعری اور علم طب میں بڑا درک حاصل تھا، ازواج مطہراتؓ کو خود تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ حضورؐ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ دوسری پڑھی لکھی خواتین سے بھی ان کی تعلیم مکمل کرا دیں، چنانچہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہؓ کو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک تعلیم یافتہ خاتون شفاء بنت عبد اللہ عدویہؓ نے لکھنا اور پڑھنا سکھایا[۲]

ازواج مطہراتؓ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی زندگی طویل اور ...

۱؎ بخاری کتاب العلم ۲؎ ابوداؤد کتاب الطب

ان دونوں امہات المومنین سے برابر علمی استفادہ کیا گیا، صحابہ کو جب بھی کسی معاملہ میں اشکال ہوتا تو وہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کرتے، دوسری صحابیہ خواتین بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں، ایک صحابی ایسے ہی ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم لوگ مشہور صحابیہ خاتون حضرت ام درداءؓ کے ہاں گئے اور وہاں علمی گفتگو کرنے لگے، کافی دیر گزر گئی تو ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا، انھوں نے جواب دیا نہیں، بلکہ علمی مذاکرہ سے بڑھ کر تو کوئی چیز مجھے محبوب ہی نہیں، علمی مذاکرے اور مباحثے صحابہؓ اور صحابیاتؓ میں نہایت پسندیدہ اور ضروری سمجھے جاتے تھے، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب حضورؐ کے درس سے فارغ ہوتے تھے، تو آپس میں مذاکرہ ضرور کرتے تھے، کبھی کبھی ہم لوگ پچاس ساٹھ ہوتے تھے، اور ہر شخص باری باری دہراتا تھا، اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ جو کچھ پڑھا ہے وہ گویا دل پر نقش ہو گیا ہے خود رسول اللہؐ بھی اس کا لحاظ فرماتے تھے، کہ تعلیم دینے میں تدریج اور سہولت سے کام لیں، ایک بار ہی اتنا نہ پڑھائے کہ لوگ یاد نہ رکھ سکیں اور اکتا جائیں، جن لوگوں کو معلم بنا کر باہر بھیجتے ان کو بڑی تاکید فرماتے تھے، کہ نرمی سے کام لینا، لوگوں کو مشکل میں مبتلا مت کرنا، لوگوں کو برگشتہ اور متنفر نہ کرنا بلکہ حوصلہ افزائی کرنا۔[۱]

تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ تفریح اور مردانہ کھیلوں کی طرف بھی پوری توجہ دیتے تھے، گھوڑ سواری، دوڑ، تیرنا، نیزہ بازی کی مشق، کشتی، اور اس طرح کے کھیل جو ان دنوں رائج تھے، مدینہ میں حضورؐ کی نگرانی اور سرپرستی میں کھیلے جاتے تھے، اول آنے والوں کو خود دربار رسالتؐ سے انعامات بھی ملتے تھے، خود حضورؐ

[۱] صحیح بخاری باب بعث معاذ الی الیمن ج دوم ص ۲۲۳۔

نے بھی ایک بار گھوڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ گھوڑ دوڑ کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔[۱]

عہد نبویؐ میں جس نظام تعلیم کی بنا ڈالی گئی تھی وہ خلافت راشدہ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے دور میں اپنی پوری ترقی کو پہونچا حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں بستی بستی گاؤں گاؤں، قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا، باقاعدہ تنخواہ دار اساتذہ مقرر کیے،[۲] بچوں کے لیے الگ مکتب یعنی پرائمری اسکول قائم ہوئے جہاں قرآن کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے شہ سواری وغیرہ چیزوں کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی، یہ تعلیم جبری تھی، اور ہر شخص کے لیے لازمی تھی، حتی کہ قیدیوں کو بھی جبراً پڑھایا جاتا تھا، ایسے ہی ایک صاحب ابوعامر سلیم نوعمری میں جنگی قیدی بن کر آئے تھے، جبری تعلیم پا کر بڑے محدث بنے۔ حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی بعض ضروری اور اہم سورتوں پر مشتمل ایک منتخب نصاب بھی مرتب کیا۔ جس کی بابت حکم دیا کہ اسکا تفصیلی مطالعہ ہر شخص کے لیے ضروری ہوگا۔ کیونکہ ان میں احکام و فرائض مذکور ہیں۔[۳] بڑے بڑے شہروں میں قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے مرکز قائم ہوئے، شام کے تین بڑے شہروں، دمشق، حمص اور فلسطین میں معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامتؓ اور ابو درداؓ قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ ابو درداءؓ کے درس میں ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک روز شاگردوں کی تعداد شمار کرائی گئی تو سولہ سو طالب علم ان کے حلقۂ درس میں موجود تھے، وہ فجر بعد دس دس طالب علموں کی جماعت بنا کر اپنے کسی تجربہ کار اور فارغ التحصیل شاگرد کی نگرانی میں دیدیتے تھے، اور خود ٹہلتے جاتے اور پڑھنے والوں کی طرف کان لگائے رہتے تھے، جب کوئی طالب علم ابتدا قرآن مجید یاد کر لیتا تو براہ راست ابو درداءؓ کی شاگردی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگتا تھا۔[۴] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عربی زبان و ادب کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی، اسکے علاوہ

[۱] دار قطنی ج ۲ ص ۵۵۲، و جمع الجوامع سیوطی وغیرہ [۲] سیرۃ العمرین لابن الجوزی بحوالہ الفاروق دوم [۳] کنز العمال ج ۱ ص ۲۱۱ [۴] ایضاً ص ۲۲۸

فقہ کی اعلیٰ تدریس کے لیے جید اہل علم صحابہ کی بڑی تعداد کو حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں مامور کیا، فقہ کی تدریس کے لیے بعض اصحاب کو باقاعدہ تنخواہیں بھی دی جاتی تھیں، ابو مسلم خولانی کا بیان ہے کہ حمص کی جامع مسجد میں تیس بڑے بڑے صحابہ فقہ کا درس دیتے تھے، ان میں جب کوئی اختلاف یا شک پیدا ہوتا تھا تو حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرف رجوع کرتے تھے، جو گویا اس شریعت کلیہ کے سربراہ تھے۔

ان انتظامات کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے یہ بھی حکم دیا کہ بازار میں کوئی ایسا شخص کاروبار نہ کرے جو علم فقہ نہ جانتا ہو۔ حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو سزا دیتے تھے، جو فقہ نہ جاننے کے باوجود بازار میں بیٹھیں، اس طرح آپ نے بازاروں کو تجارت گاہوں کے ساتھ ساتھ درسگاہیں بھی بنا دیا جہاں لوگ باتوں باتوں میں فقہ سیکھتے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں علم جغرافیہ کی خصوصی تربیت کے بھی شواہد ملتے ہیں، وہ مختلف مفتوحہ ممالک کے جغرافیائی سروے کرنے کے لیے ماہرین کی جماعتیں بھیجتے رہتے تھے، اس طرح کی ایک سروے رپورٹ حضرت عمرو بن العاصؓ نے بھیجی تو وہ اس قدر جامع اور تفصیلی تھی کہ حضرت عمرؓ پکار اٹھے اے عاص کے بیٹے، خدا تم کو جزائے خیر دے، تم نے تو ایسی رپورٹ بھیجی ہے جیسے میں خود مصر کو دیکھ رہا ہوں، عرصہ ہوا مشہور فرانسیسی اخبار Fegaro نے اس رپورٹ کا ترجمہ شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اسکو بلاغت، جامعیت اور واقفیت کے ایک اعلیٰ نمونہ کے طور پر تعلیمی اداروں کے لازمی مطالعہ میں شامل کیا جائے، حضرت علیؓ کے دور میں عربی گرامر کے اصول بھی آپ کی ذاتی نگرانی میں مرتب ہوئے اور غیر عرب طلبہ کے لیے نصاب تعلیم میں ایک نئے مضمون کا اضافہ ہوا[1]۔

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے زمانے کے نظام تعلیم کا یہ ایک مختصر کا خاکہ ہے، اگر اور محنت کی جائے تو بہت کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

[1] فہرست ابن ندیم ص۔ ۶۰ و مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۲۶

فارسی زبان کی ایک اہم تاریخ

زین الاخبار گردیزی

از

ڈاکٹر ریحانہ خاتون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

زین الاخبار ایران کی ایک مختصر عمومی تاریخ ہے جس میں ایران قدیم کے افسانوی بادشاہ طہمورث سے لے کر ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدجرد کے حالات اختصاراً پانچ طبقوں میں بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد دو باب میں ابتدائے اسلام سے لے کر سلطان مودود غزنوی[1] کی جانشینی کے حالات نسبتاً کچھ تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، آٹھویں باب میں رومی، ہجری اور ہندوؤں کی تقویم اور تاریخ کا ذکر ہوا ہے اور بعد کے آٹھ ابواب میں مختلف مذاہب یعنی مسلمان، یہودی، عیسائی، زرتشتی اور ہندوؤں کے تیوہاروں کی توضیح و تشریح ملتی ہے،

اندر اسباب عیدھا، اندر عیدھار جہودان، بجدول عیدھار جہودان، اندر اسباب عیدھار جہودان، اندر عیدھای ترسایان بجدول، شرح و اسباب عیدھای ترسایان، اندر عیدھا و رسم ھای مغاں بجدول، اندر شرح جشن ھا و عیدھای مغان، اندر عیدھای

[1] مودود بن مسعود اپنے باپ کے ۴۳۲ھ میں مقتول ہو جانے کے بعد تخت نشین ہوا، سلطان عبدالرشید جس کے دور میں زین الاخبار مرتب ہوئی وہ مودود کا چچا تھا اور اس کے بعد تخت پر بیٹھا۔

ہندوان بجدول، اندر شرح عیدھای ہندوان، آخری تین ابواب میں ترکوں، رومیوں اور ہندوؤں کے علوم و معارف کا ذکر ہے۔

دراصل ابواب کا یہ خلاصہ موجودہ مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے اور یہ نسخہ ناقص ہے اور چونکہ اس کتاب کے دو ہی قلمی نسخے موجود ہیں جن میں دوسرا پہلے کی نقل ہے، اس لئے اصل کتاب کے نقص کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ کتاب کا اصل مقدمہ مؤلف بھی موجود نہیں ہے اور درمیان سے بھی ابواب[1] کے غائب ہونے کا پتہ چلتا ہے اور دونوں موجودہ نسخوں میں ابواب کا شمار ترتیب سے نہیں ہے۔ ابواب کے شمار سے بھی واضح ہے کہ دونوں نسخوں میں سے کچھ حصے غائب ہیں۔

زین الاخبار کا مؤلف ابو سعید عبدالحیٔ بن ضحاک بن محمود گردیزی ہے جس نے ۴۴۲ھ-۴۴۴ھ کے قریب یہ تاریخ مرتب کی، گردیزی کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں، سوائے اس کے کہ وہ دربار غزنی سے وابستہ تھا اور نام کی نسبت سے واضح ہے کہ وہ گردیز کا رہنے والا تھا جو غزنی سے ۶۰ میل مشرق اور کابل سے ۱۲۵ میل جنوب مغرب میں اب بھی ایک قصبہ موجود ہے۔

گردیزی نے اس کتاب کو سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود کے دور میں (۴۴۱ھ-۴۴۳ھ) میں لکھی اس لئے کہ اس نے سلطان عبدالرشید کو "ادام سلطانہ"[2] کے دعائیہ فقرہ سے یاد کیا ہے۔ کتاب کا نام زین الاخبار اسی بادشاہ کے ایک لقب "زین الملہ" کی مناسبت سے رکھا گیا۔ کتاب کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں بیرونی کو

[1] باب ششم کے دونوں خطی نسخوں میں باب نہم شروع ہو جاتا ہے، البتہ مطبوعہ نسخے میں ترتیب قائم رکھنے کے لئے باب نہم اور اس کے بعد کے ابواب کو ہفتم، ہشتم وغیرہ لکھا گیا ہے۔

[2] رک زین الاخبار ص ۹۸، ۱۲۷، ۲۰۶۔

رحمۃ اللہ علیہ کے فقرے سے یاد کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ بیرونی اس وقت فوت ہو چکا ہے، بیرونی کی وفات ۴۴۲ھ کے بعد قرار دی گئی ہے۔

گردیزی نے سلطان محمود غزنوی کے حالات اور فتوحات کا جس طرح حال لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں موجود تھا۔

اگرچہ زین الاخبار کے سارے ماخذوں کا حال معلوم نہیں، البتہ اس کے بعض ماخذ اس طرح ہیں۔ مثلاً

۱- گردیزی نے ابوریحان البیرونی سے ملاقات اور اس کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی کی دو[1] کتابیں "کتاب الہند" اور "آثار الباقیہ" اس کے پیش نظر رہی ہیں "جدول عیدھای" کے ضمن میں لکھا ہے

"من آنچہ یافتم بخاصہ از کتب خواجہ ابوریحان رحمہ اللہ بیاوردم۔" (ص ۱۵۰)

ہندوؤں کی عید کے سلسلہ میں پھر لکھتا ہے

"فراز آورندۂ این کتاب ابو سعید عبدالحیٔ بن الضحاک چنین شنیدم از خواجہ ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی رحمہ اللہ" (ص ۲۵۲)

۲- گردیزی کا دوسرا اہم ماخذ ابو عبداللہ[2] محمد بن احمد جیہانی کی ایک کتاب "المسالک والممالک" ہے،

[1] دیکھئے زین الاخبار ص ۲۱۰، ۲۵۲، [2] ابو عبداللہ محمد بن احمد بن نصر جیہانی جمادی الاول ۳۰۲ھ میں وزیر ہوا، اس کی وفات ۳۳۰ھ میں ہوئی، وہ نہایت فاضل اور دانشمند تھا، متعدد کتابوں کا مؤلف تھا جن میں کتاب المسالک والممالک بہت مشہور تھی مگر منجملہ اور تصانیف کے یہ کتاب بھی مفقود ہے، البتہ اس کے اجزا ابعد کے مصنفین کی کتابوں میں مل جاتے ہیں، دیکھئے مینورسکی: شرف الزماں طاہر مروزی، مقدمہ ص ۶ ببعد۔ خود گردیزی نے جیہانی کی بابت لکھا ہے:۔

اگرچہ یہ کتاب مفقود ہے لیکن بعد کے مصنفوں نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے اور ان کی تالیفات میں ابوعبداللہ جیہانی سامانی بادشاہ نصر بن احمد (۳۰۱ - ۳۳۱ م) کا وزیر صاحب تصانیفِ عدیدہ تھا مگر اب اس کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ زین الاخبار میں بھی جیہانی کا تین جگہ ذکر آیا ہے۔ پہلی بار نصر بن احمد کے ذیل میں جس کے دربار میں اس کو وزارت کا عہدۂ جلیلہ عطا ہوا تھا۔ دوسری بار معارف ہندواں کے ذیل میں لکھتا ہے

چنیں گوید: ابوعبداللہ جیہانی اندر کتاب تواریخ که او کرده است که ایشاں هفت گروه اند، اوّل را ساکبتری گویند۔» الخ (ص ۲۸۶)

تیسری بار اسی ذیل میں پھر لکھتا ہے

چنیں گوید ابوعبداللہ جیہانی که هندواں را نود و نه فرقه است اندملّت» الخ (ص ۲۸۸)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۳)، صاحب تدبیرش ابوعبداللہ محمد بن احمد الجیہانی بود، کارہا بر وجه نیکو پیش گرفت و همی راند، و ابوعبداللہ جیہانی مردے دانا بود و سخت هوشیار و چابک و فاضل، و اندر همه چیزها بصارت داشت و او را تالیفهای بسیار است اندر هر فنی و علمی، و چوں او به وزارت نشست به همه ممالک جهاں نامه نوشت و رسمهای همه درگاهها و دیوانها بخواست تا نسخت کردند و بنزدیک او آوردند چوں ولایت روم و ترکستان و هندوستان و چین و عراق و شام و مصر و زنج و زابل و کابل و سند و عرب، همه رسمهای جهاں بنزدیک او آوردند و آن همه نسختها پیش نهاد الخ (زین الاخبار ص ۱۵) ابوعبداللہ محمد جیہانی کا بیٹا ابوعبداللہ احمد ۳۶۵ھ میں منصور بن نوح کا وزیر مقرر ہوا، اسی سال منصور کا انتقال ہو گیا، اس لئے احمد کی وزارت بھی دیر تک قائم نہیں رہی (رک زین الاخبار ص ۱۶)

ان دونوں اقتباسات میں گردیزی نے جیہانی کی کتاب کا اصل نام نہیں لکھا ہے البتہ معارف ترکان کے ذیل میں اس کی کتاب مسالک و ممالک کا ذکر اسی طرح آیا ہے۔

«این بود تمامی معارف ترکان که یافته شد بعضی از مسالک و ممالک جیہانی»[1] (ص ۲۷۹)

۲۔ گردیزی نے عبید اللہ بن عبد اللہ معروف بہ ابن خرداذبہ[2] کی بعض کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے چنانچہ معارف ترکان کے ذیل میں «بعضے از کتاب عبید اللہ خرداذبہ» کا ذکر آیا ہے اور اس سے پہلے بھی اس کی یہ عبارت ملتی ہے۔

«عبید اللہ بن خرداذبه که هر کس اندر چنیں شود به علم دانا و بزرگ گردد» الخ (ص ۲۶۹)

۴۔ مشہور دانشمند عبد اللہ بن المقفع[3] کی بعض تصانیف سے گردیزی نے استفادہ کیا ہے چنانچہ زین الاخبار میں وہ لکھتا ہے

«و چنیں گوید: ابو عمرو عبد اللہ ابن المقفع اندر کتاب ربیع الدنیا که چوں نوح پیغمبر علیه السلام از کشتی بیروں آمد» الخ (۲۵۶)

[1] یہ کتاب سات جلدوں میں تھی مگر اب ناپید ہے سوائے ان اجزاء کے جو دوسری کتابوں میں منقول ہیں۔

[2] ابن خرداذبہ ۲۲۱ھ میں پیدا ہوا اور ۳۰۰ھ میں اس نے وفات پائی، وہ مختلف کتابوں کا مصنف ہے جن میں سب سے اہم المسالک والممالک ہے جو ۲۳۲ھ کے قریب تالیف ہوئی۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں لائیڈن میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری کتاب «مختار من کتاب اللھو والملاھی» بھی موجود ہے۔ مرحوم استاد سعید نفیسی کا خیال ہے کہ زین الاخبار میں ان دونوں کتابوں سے استفادہ نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک دوسری کتاب «جمهرة انساب الفرس» سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[3] عبد اللہ ابن المقفع عظیم مصنف گذرا ہے، اس کے ذریعہ متعدد کتابیں یونانی سے عربی میں منتقل ہوئیں۔ اس کی تصانیف میں کتاب التاج، ادب الکبیر، ادب الصغیر، ترجمہ کلیلہ و دمنہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۴۵ھ میں مقتول ہوا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے لغت نامہ دہخدا ذیل ابن المقفع)

ایک اور جگہ ایک کتاب توضیح الدنیا کا نام ملتا ہے (ص ۲۷۹)

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ توضیح الدنیا ربع الدنیا کے بجائے غلط درج ہوگیا ہو، استاد حبیبی نے توضیح کی ایک دوسری شکل توزیع درج کی ہے (زین الاخبار ص ج)

۵۔ استاد نفیسی نے لکھا ہے کہ ظاہراً امرای خراسان کا باب ابوعلی سلامی متوفی ۳۰۰ھ کی کتاب ولاۃ خراسان[1] سے ماخوذ ہے، حبیبی صاحب بھی اس رائے سے متفق ہیں لیکن گردیزی نے اس ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ (مقدمہ ص ج)

۶۔ گردیزی نے ابوزید حکیم[2] بلخی مشہور جغرافیہ نویس (۲۳۵ - ۳۲۲ھ) کی تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"ابوزید حکیم چنین گوید کہ ترکان غرجگان چینیاں اند" الخ (ص ۲۷۹

اگرچہ ابوزید ۶۰ کتابوں کا مؤلف بتایا جاتا ہے منجملہ ان کے صور الاقالیم ہے لیکن معلوم نہیں گردیزی نے یہ قول کس کتاب سے نقل کیا ہے۔

۷۔ گردیزی نے ایک واقعہ اپنے ایک ہم وطن اور معاصر احمد بن ونک گردیزی سے نقل کیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ یہ واقعہ اس نے اس سے سُن کر یا اس کی کتاب سے لکھا ہے (ص ۲۸۷)

۸۔ استاد عبدالحیٔ حبیبی نے بعض شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ گردیزی نے ابن رُستہ (متوفی ۲۹۰ھ[3]) کی کتاب "الاعلاق النفیسہ" سے بھی استفادہ کیا ہے۔

---

[1] التاریخ فی اخبار ولاۃ خراسان ناپید ہے لیکن اس کے بعض اجزا بعد کے مصنفین کی تحریروں میں مل جاتے ہیں،

[2] ابوزید احمد بن سہیل بلخی کا شمار نوابغ روزگار میں ہوتا ہے، اس دور کے علوم و فنون کے جملہ شعبوں پر اس نے قلم اٹھایا ہے، اس کی تصانیف کی ایک طویل فہرست لغت نامہ دہخدا میں ملتی ہے۔

[3] ابوعلی احمد بن عمر ابن رستہ اصفہانی جغرافیہ نویس، قرن سوم۔ اس کی کتاب ۱۸۹۱ء میں لیڈن سے طبع ہو چکی ہے۔

زین الاخبار اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک بے نظیر تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے بعض مندرجات ترکوں اور ہندوؤں کے علوم[1] و فنون وغیرہ سے متعلق صرف اسی کتاب میں تفصیل سے ملتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوؤں کے علوم کا بڑا ماخذ ابوریحان کی کتاب الہند ہے لیکن ترکوں کے علوم کا کوئی اپنا قدیم ماخذ سوائے ابن خرداذبہ کی کتاب کے باقی نہیں رہا ہے۔ ہندوؤں کے علوم کا یہ تیسرا اہم[2] ماخذ قرار پائے گا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابوریحان اور ابن خرداذبہ کی کتابیں عربی میں ہیں اور زین الاخبار فارسی میں، گویا فارسی میں ہندوؤں کے علوم پر یہ سب سے قدیم ماخذ ہے۔

اس کتاب کی زبان بھی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ اس کی زبان سادہ اور رواں ہے اور بعض لحاظ سے تاریخ بیہقی سے زیادہ قابل قدر ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں سعید نفیسی صاحب کا حسب ذیل بیان نہایت درجہ قابل توجہ ہے۔

"چہ از حیث روش فارسی نویسی بسیار بلند و بسیار سادہ و روان؛ وچہ از حیث نکات تاریخی کہ در ہیچ کتاب دیگر نیست برای ایرانیان بیش از ہر تاریخ نامۂ دیگری اہمیت دارد (ص ۲۱۳)

زین الاخبار گردیزی کے نسخے کمیاب ہیں، اس کے صرف دو نسخے موجود ہیں ایک کنگز کالج (Kings College) کیمبرج میں جس کی کتابت شاید ۹۳۰ھ میں ہوئی اور

---

[1] ہندوؤں کے علوم سے گردیزی کو خصوصی دلچسپی تھی چنانچہ زین الاخبار میں لکھتا ہے

"بدان کہ تاریخہای کہ مستعمل است و ہمہ منجمان و اہل حساب آن را استعمال کنند سہ تاریخ است، چون رومی و عربی و فارسی و من باین ہرسہ تاریخ ہندوان ضم کردم" الخ (ص ۲۸۷)

[2] گردیزی کے نصف صدی بعد شرف الزمان طاہر مروزی گزرا ہے۔

دوسرا نسخہ کتاب خانہ بادلیان آکسفورڈ میں ہے جو ۲۱ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا۔ یہ دونوں نسخے ہندوستان میں تحریر ہوئے اور ایک دوسرے کی ہو بہو نقل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس اہم کتاب کا فقط ایک ہی نسخہ اور وہ بھی ناقص حالت میں باقی رہ گیا تھا اور اسی سے یہ دونوں نسخے تیار ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ گردیزی کے ہم عصر یعنی ابو الفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی[1] کے نسخے بھی ناقص حالت ہی میں دستیاب ہیں اور جس طرح زین الاخبار کے نسخوں کی بنیاد محض ایک ناقص نسخے پر ہے جس میں درمیان سے بھی سیکڑوں اوراق غائب ہیں اسی طرح تاریخ بیہقی میں بھی شروع اور درمیان سے پچاسوں اوراق غائب ہیں۔ عالم اسلام کو منگولوں سے جو بڑے نقصانات ہوئے اُن میں سے اہم کتابوں کی بربادی بھی ہے۔ اسی بربادی میں زین الاخبار، تاریخ بیہقی اور لباب الالباب وغیرہ کو نقصان پہونچا۔

زین الاخبار اور اس کے مصنف کا نام ایک نسخے پر خط شکستہ میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔

"ھو اللہ اکبر جل جلالہ

تاریخ زین الاخبار، من تصنیف ابو سعید عبد الحیٔ ابن الضحاک بن محمود گردیزی، واقع

---

[1] تاریخ بیہقی تین جلدوں میں لکھی گئی تھی جو دولت غزنوی کی ابتدا سے سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ-۴۹۲ھ) کے اوائل تک کے واقعات پر مشتمل ہے، لیکن اب اس کے چند حصے ہی باقی ہیں جو سلطان مسعود ابن محمود (م: ۴۳۲ھ) آل خوارزم حکومت التونتاش کے حالات میں ہیں۔ یہ باقی ماندہ تاریخ دفعتہً شروع ہو جاتی ہے گویا ابتداء، درمیان اور آخر سے سیکڑوں صفحے غائب ہیں اور اسی ناقص حالت میں تین بار طبع ہو چکی ہے، اس اہم تاریخ کی دریافت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

چہاردہم شہر ربیع الثانی، روز پنجشنبہ سنہ ۲۷ محمد شاہی ابتیاع نمودہ، امانت از سبحانہ تعالیٰ است۔"

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے عرصہ سے فضلا اس کی طرف متوجہ رہے لیکن اچھے نسخے کی نایابی اس کی اشاعت میں مانع رہی ہے۔ ۱۸۹۳ - ۱۸۹۴ - ۱۸۹۷ء میں پیٹرس برگ میں روسی ترجمہ کے ساتھ مشہور روسی دانشمند بارتھولڈ نے اسباب و معارف ترکان کے حصہ کو شائع کیا۔ اس کے بعد اسی حصہ کو ۱۹۰۳ء میں خاورشناس گزاکون نے دوبارہ شائع کیا۔ بارتھولڈ نے ۱۸۹۸ء میں تاریخ خراسان سے متعلق حصہ پیٹرس برگ میں شائع کیا۔ ۱۹۱۴ء میں اسی حصہ کو جس کو بارتھولڈ شائع کر چکے تھے، مرزا عبد اللہ غفاروف نے نشر کیا۔ اس کا ایک حصہ اخبار امرائے خراسان سے لے کر باب ہفتم کے خاتمہ تک ڈاکٹر محمد ناظم استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تصحیح سے ۱۹۲۸ء میں برلن سے شائع ہوا اور یہی حصہ دوبارہ ۱۳۱۵ شمسی (۱۹۳۷ء) میں تہران میں چھپا جس پر مرزا محمد قزوینی کا مقدمہ تھا۔ ۱۳۲۵ فروردین (۱۹۵۰ء) میں جشننامۂ مغاں، سے متعلق حصہ یغما میں شائع ہوا۔ مرحوم سعید نفیسی نے ۱۳۴۷ شمسی (۱۹۶۲ء) میں طبقہ چہارم سے لے کر باب ہفتم کے خاتمہ تک کتابی شکل میں ایک اچھے دیباچے کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ آخر میں استاد عبد الحیٔ حبیبی نے ۱۳۴۷ھ (۱۹۶۹ء) میں پوری تاریخ زین الاخبار دونوں موجودہ نسخوں اور شائع ہوئے حصوں کی مدد سے بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے شائع کیا جس کے مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مقدمہ مصحح الف - و، متن کتاب ۱ - ۲۹۹، فہرست و تعلیقات ۳۰۱ - ۳۵۱،

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشہور مستشرق مینورسکی نے اس کتاب کا ۱۹واں باب جو ہندوؤں کے علوم سے متعلق ہے، انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۹۴۸ء میں لندن سے شائع کیا۔ اس ترجمہ اور اس کے تعلیقات سے اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر مترجم کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مینورسکی کی تحقیق الزمانی مروزی

کی طبائع حیوان کو اسی طرح انگریزی کے قالب میں ڈھالا تھا، اس سے زین الاخبار کے ترجے اور تحشیے میں مدد لی گئی ہے۔

زین الاخبار کے مطبوعہ نسخے کی خصوصیت ہے کہ استاد حبیبی نے اس کی تصحیح میں بڑی توجہ صرف کی ہے۔ خصوصاً وہ حصے جو ترک، چین اور ہندوستان کے علوم وغیرہ سے متعلق تھے، ان کی تصحیح میں انھوں نے اس موضوع پر جتنے مواد ملے اُن سب کا احاطہ کیا ہے، ان کی فہرستیں بھی بڑی سودمند ہیں، ایک فہرست میں نوادر لغات جمع کر دئے گئے ہیں، اور دوسری میں چند لغت کے بارے میں مفصل بحث ملتی ہے، آخر میں نفیسی اور قزوینی کے مقدمات بھی درج ہیں، جن سے کتاب کی افادیت میں خاصی مدد ملتی ہے، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ چونکہ زین الاخبار کے نسخے ناقص اور نامکمل ہیں، اس لئے مطبوعہ نسخہ بھی ناقص اور نامکمل ہی ہے اور جب تک کوئی دوسرا نسخہ اور نہ مل جائے، اس کے نقائص دور نہیں ہو سکتے لیکن اس کی ابھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

خیّام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، فارسی رباعی گوئی کی تاریخ، اور خیام کی رباعیات پر مفصل بحث، آخر میں خیام کے چھ نایاب عربی و فارسی فلسفیانہ رسالوں کا ضمیمہ اور اسکی رباعیات کے ایک مستند ترین قلمی نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام پر یہ سب سے مفصل، مکمل، جامع اور محققانہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے، وہ اپنے عہد میں ایک رباعی گو شاعر سے کہیں زیادہ ایک فلسفی، منجم، ہیئت دان حکیم اور طبیب کی حیثیت سے مشہور تھا، اس کتاب میں اسکی انہی حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔　　از مولانا سید سلیمان ندوی طبع دوم عکسی، معارف پریس اعظم گڈھ

قیمت ۔۔۔ ۶۵

منیجر

اَمامؔ زعفرانی

از۔ حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دارالمصنفین،

امام شافعی کے بغدادی تلامذہ میں سب سے نمایاں، ان کی فقہ قدیم کے سب سے بڑے راوی اور اپنے ہم عصروں اور ہمسروں میں سب سے زیادہ ممتاز نام امام زعفرانی کا ہے، جو فصیح اللسان اور بہت بڑے زبان دان تھے، ان کا پورا نام حسن بن محمد بن صباح ہے، ابو علی کنیت ہے، بغدادی اور زعفرانی دونوں نسبتوں سے معروف ہیں، سنہ ولادت کا ذکر کہیں نہیں ملتا، لیکن ایک اندازہ کے مطابق وہ ۱۷۵ھ یا اسی سے قریب تر برسوں میں پیدا ہوئے ہونگے کیونکہ جب امام شافعی ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے تو خود امام زعفرانی کے بقول انکے چہرہ پر ابھی خط سبزہ کا نمو بھی نہ ہوا تھا۔[1] زعفرانی کی نسبت ایک گاؤں زعفرانیہ کی جانب ہے اس نام کے دو گاؤں ہیں، ایک تو ہمدان سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، جہاں کے ابو العلاء اور ابن ابی شیبہ کے استاد ابو میسرہ زعفرانی مشہور ہیں، اور دوسری بستی بغداد کے جوار میں ہے، امام زعفرانی کا تعلق اسی گاؤں سے ہے،[2] امام ذہبی کا خیال ہے کہ امام زعفرانی کی نسبت محلہ زعفران سے متعلق ہے، لیکن امام ابن سبکی اس کی تردید کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ امام زعفرانی

---

[1] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۹، نیز ملاحظہ ہو معجم البلدان، یاقوت حموی ج ۴ ص ۱۳۹۰،

[2] مرآۃ الجنان، یافعی، مکی ج ۲ ص ۱۱۱،

حصول علم کی غرض سے بغداد آئے، اور ایک محلہ میں جو باب الشعیر سے کرخ تک پھیلا ہوا تھا[1] قیام کیا یہاں تک کہ وہ محلہ امام زعفرانی کی شہرت کے ساتھ ان سے منسوب ہو کر مشہور ہوا[2] اس باب میں قول فیصل خود امام زعفرانی کا بیان ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب امام شافعیؒ کی مجلس میں پہلی بار میں نے کتاب الرسالہ کی قرأت کی تو امام شافعی نے دریافت کیا تم عرب کے کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو میں نے عرض کیا کہ میں عرب نہیں ہوں، زعفرانیہ دیہات کا رہنے والا ایک دیہاتی ہوں، امام شافعی یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا، تب تو تم اس گاؤں کے گل سرسبد ہو[3]۔

امام زعفرانی کے اساتذہ و شیوخ میں جلیل القدر محدثین فقہاء اور اصحاب کمال مثلاً سفیان بن عیینہ، عبدہ بن حمید، عبدالوہاب ثقفی، وکیع بن جراح، ابن عطاء، ابن علیہ، عفان بن مسلم، یحییٰ بن عباد، شبابہ بن سوار، سعید بن سلیمان واسطی اور یزید بن ہارون کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں،[4] اور اس سلسلۃ الذہب میں سب سے زیادہ درخشاں امام شافعی کی ذات گرامی ہے، وہ بغداد ۱۹۵ھ میں تشریف لائے اور یہاں تقریباً دو برس قیام کیا، اس عرصہ میں انھوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کی خواہش پر مشہور زمانہ کتاب الرسالہ کی تالیف اور کتاب الحجۃ کی تصنیف کی، ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ اسی دور میں امام زعفرانی نے امام شافعی سے تقریباً تیس رسالوں پر مشتمل ان کی کتاب پڑھی، اور ان کا املا کیا، ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ یہ رسالے کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہیں،[5] امام زعفرانی فرماتے ہیں کہ تب ہم امام شافعی کے رسالوں کو ایک ہی دن میں لکھتے اور

---

[1] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۰، تاریخ بغداد، خطیب بغدادی ج، ص ۴۰۰ ۔ [2] ایضاً

[3] تاریخ بغداد: خطیب بغدادی ج، ص ۴۰۰، معجم البلدان ج ۴ ص ۳۹۰ [4] ایضاً طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۵۱ [5] الانتقاء، ابن عبدالبر ص ۸۴،

پڑھتے تھے، اس وقت ہم ان کی اہمیت کے بارہ میں زیادہ سنجیدہ نہ تھے، اور نہ ہمارے سان و گمان میں یہ بات تھی کہ ایک دن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہو جائے گی، ان کی اہمیت اس وقت ان کی نظر میں اس لئے نہ تھی کہ وہ اس وقت کوفیوں (حنفیوں) سے مرعوب تھے،[1] بغداد میں، امام شافعی کی تشریف آوری پر یہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور علم فقہ میں اس درجہ مہارت و کاملیت حاصل کی کہ امام شافعی کے مصر تشریف لے جانے کے وقت وہ عراق میں ان کے طرز اجتہاد اور طریق استنباط کے نمایاں ترین ترجمان و نمایندہ ہو گئے۔

بغداد اُس وقت حجاز و مصر کے برعکس حنفی مکتب فکر کا سب سے بڑا مرکز تھا، اور یہاں کثرت سے علماء امام ابو حنیفہؒ کے علم اور فقہ سے متاثر تھے، امام زعفرانی بھی ان طالب علموں میں تھے جو حنفی المسلک تھے لیکن شاید فطری میلان اور علم حدیث سے خاص شغف کی بنا پر جس کا اندازہ ان کے مذکورۂ بالا اساتذہ کے ناموں سے ہوتا ہے، امام شافعیؒ کی آمد کے موقع پر وہ کشاں کشاں ان کی خدمت میں سب سے پہلے پہونچے اور نوعمری کے باوجود اپنی ذہانت، لیاقت اور غیر معمولی فہم و ادراک کی وجہ سے امام شافعی مقرب خاص ہو گئے، بغداد میں امام شافعیؒ کی مجلس میں شریک ہونے والوں میں امام احمد بن حنبل امام ابو ثور اور کرابیسی کی سی عظیم ہستیاں تھیں، امام احمد بن حنبلؒ تو امام شافعیؒ کی مجلس کے مستقل شرکاء میں سے تھے، امام زعفرانی فرماتے ہیں کہ میں جب بھی امام شافعیؒ کی مجلس میں حاضر ہوا یا جب بھی کچھ بھی پڑھا تو امام احمد بن حنبلؒ کو موجود پایا،[2] سب سے پہلی مرتبہ امام شافعیؒ کی مجلس علم میں یہ سب ہی حضرات موجود تھے،

---

[1] تاریخ بغداد خطیب ج ۷ ص ۴۰۸ [2] طبقات شیرازی ص ۷۸

اور جب امام شافعیؒ نے قرأت کتاب کے لئے دریافت کیا کہ تم لوگوں میں سے کون کتاب خوانی کرے گا؟ تو یہ حضرت باوجود اپنی وجاہت علمی کے خاموش رہے، امام شافعیؒ کی جلالت شان، ان کے علمی دبدبہ اور بے مثل زبان دانی کے سامنے کتابوں کی قرأت یوں بھی آسان نہ تھی، لیکن امام زعفرانی نے اس پر لبیک کہا، وہ کہتے ہیں کہ میرے علاوہ کسی نے یہ جرأت نہ کی، حالانکہ میں سب سے نوعمر تھا، اور میرے چہرہ پر ابھی خط سبزہ تک کا ظہور نہ ہوا تھا۔[1] بعد میں اس واقعہ کو یاد کرکے وہ فرماتے کہ وانی لاعجب من انطلاق لسانی وجسارتی بین یدیہ۔ کہ اب میں خود امام شافعیؒ کے حضور اس جسارت لسانی پر تعجب کرتا ہوں اور اس کے بعد وہ مستقل ان کی مجلس میں کتاب خوان ہوگئے، انھوں نے ان سب ہی رسالوں کی قرأت کی سوائے دو رسالوں کے کتاب المناسک اور کتاب الصلوٰۃ کے جنھیں امام شافعیؒ نے خود ہی پڑھا، ابن حبان لکھتے ہیں کہ احمد بن حنبلؒ اور ابو ثورؒ امام شافعیؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے لیکن قرأت کا امتیاز امام زعفرانی کو حاصل ہوتا۔[2] امام شافعیؒ کو ان پر مکمل اعتماد تھا، چنانچہ ۱۹۸ھ میں جب وہ دوبارہ چند مہینوں کے لئے بغداد تشریف لائے تو امام کرابیسی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتابوں کی اجازت انھیں دیدیں لیکن انھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ زعفرانی کی کتابوں کو لو اور انھیں لکھ لو میں ان کتابوں کی اجازت تمھیں دیتا ہوں۔[3] لیکن امام زعفرانی کی جس صلاحیت نے امام شافعیؒ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا، وہ ان کی عربی زبان میں مہارت وقدرت تھی، بغداد سے مصر تشریف لے جانے کے بعد بھی وہ اپنے اصحاب مصر کے سامنے امام زعفرانی کی اس صلاحیت کو مدح

---

[1] تہذیب الاسماء، نووی ج ۱ ص ۱۷۰ و تاریخ بغداد و طبقات کبریٰ۔ [2] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۵ [3] الانتقاء، ابن عبد البر ص ۷۶۔

وستائش کے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے، امام مزنی فرماتے ہیں کہ ایک بار ہمارے سامنے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں نے بغداد میں ایک غیر عربی ایسا پایا جس کی زبان دانی اور سخن فہمی پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے، جتنا کسی عربی الاصل پر ہوسکتا ہے، بسا اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ اصلاً عربی تو وہ ہے اور میں نبطی وعجمی ہوں، کسی نے دریافت کیا کہ حضرت اس درجہ کامل وماہر شخص کون ہے؟ فرمایا، زعفرانی![1] بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی انھیں لغت کا امام،[2] اپنے دور کا سب سے فصیح اللسان[3] اور اہل زبان تسلیم کیا،[4] اس کے ساتھ ہی ان کی منزلت علمی کا بھی اعتراف اعلیٰ الفاظ میں ہوا، امام سبکی انھیں امام جلیل، فقیہ، محدث، فصیح، بلیغ اور ثقہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، امام ماوردی کا قول ہے کہ قدیم فقہ شافعی کے چار اہم راوی امام احمد بن حنبلؒ، ابو ثور، کرابیسی اور امام زعفرانی ہیں، ان میں زعفرانی کا شمار ثابت ترین راوی کی حیثیت سے ہوتا ہے، امام یافعی مالکی انھیں ذہین ترین علماء میں شمار کرتے ہیں، وہ ان کی حدیث وفقہ میں مہارت تامہ اور ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے فقہ شافعی کی مقبولیت میں ان کے اثرات کا اعتراف کرتے ہیں،[7] امام نسائی انھیں ثقہ اور ابن المنادی انھیں احد الثقات قرار دیتے ہیں۔[8]

امام شافعی کو اللہ تعالیٰ نے ایسی پرکشش اور جاذب قلب ونظر شخصیت عطا کی تھی کہ ان کے آستانہ علم پر باریاب ہونے والے طالب علم سے زیادہ ان کے عاشق وفدائی کی حیثیت رکھتے، یہ وصف ان کے ہر شاگرد کی سیرت میں کم وبیش مشترک نظر آتا ہے، امام زعفرانی کی مجلسوں میں بھی عام طور سے امام شافعی کا ذکر رہتا، وہ فرماتے کہ میں نے

---

[1] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۰ [2] طبقات الشافعیہ ابن ہدایۃ اللہ [3] اعلام، زرکلی ج ۱ ص ۲۳۰ [4] تاریخ بغداد، خطیب، ج ۷، ص ۴۰۸۔ [5] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۱ [6] مرآۃ الجنان یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۸۲۔ [8] طبقات، سبکی ص ۲۵۱۔

یحییٰ بن معین سے جب امام شافعیؒ کے بارہ میں اظہار رائے کی خواہش کی تو انھوں نے فرمایا اگر جھوٹ بھی امام شافعیؒ پر حملہ آور ہو تو امام شافعیؒ کی شرافت نفس اس کو شکست دیدیگی[1] وہ فرمایا کرتے کہ اصحابِ حدیث عالمِ خواب میں تھے، امام شافعیؒ نے انھیں بیدار کیا، اور اب جس کے ہاتھوں میں بھی قرطاس و قلم ہے، اس کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے،[2]

فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں ان کے ابتلا و آزمایش کا گو کوئی ذکر نہیں، تاہم بغداد میں جہاں ان کے ہم سبق امام احمد بن حنبل سخت شدائد و محن کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور جہاں اہل کلام کے خلاف آواز بلند کرنا گویا آزمایشوں کو دعوت دینا تھا، امام زعفرانی اپنے موقف حق پر قائم رہے، وہ فرماتے کہ میں نے خود امام شافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اہل کلام کے بارہ میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ انھیں زد و کوب کیا جائے، اونٹوں پر بٹھاکر بازاروں میں ان کی تشہیر کی جائے، اور کہا جائے کہ یہ سزا ہے تارکین کتاب و سنت کی۔[3] اس قول کی تقریر و تصویب سے گویا خود امام زعفرانی اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

امام سبکی دوسرے اصحاب شافعی کی طرح امام زعفرانی کے سب سے بڑے سوانح نگار ہیں، انھوں نے امام زعفرانی سے امام شافعی کی مروی کئی تفسیری اور حدیثی روایتیں اور مسائل نقل کئے ہیں، آیت کریمہ ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ کی تفسیر تو یہ ہے کہ ایک آدمی بیک وقت مومن و منافق بدکار و نیکوکار نہیں ہوسکتا، یا یہ کہ اللہ تعالے ایک ہی وقت میں ایک عورت کو بیوی اور باندی، اور ایک مرد کو ایک ہی وقت میں حقیقی اولاد اور متبنی اولاد کا درجہ نہیں دیتا یا یہ کہ منافقین حضورؐ کے بارے میں کہتے تھے، کہ آپ کے دو دل ہیں ایک ہمارے ساتھ اور دوسرا صحابہ کے ساتھ ہے،

[1] طبقات کبری و تاریخ بغداد [2] وفیات الاعیان و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۹ [3] الانتقاء، حافظ ابن عبد البر ص ۸۰

ان کے اس قول کی اللہ تعالے تکذیب فرماتا ہے۔[1] لیکن امام زعفرانی، امام شافعیؒ سے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ من قلبین سے مراد من الابوین ہے، یعنی ایک بیٹا دو باپوں سے نہیں ہوسکتا، امام سبکی اسی قول کی تحسین کرتے ہیں۔[2]

امام زعفرانی ہی سے ایک رافضی کے بارہ میں جو جنگ میں شریک ہوا تھا، یہ قول نقل ہے کہ اس کو مالِ غنیمت میں سے کچھ نہ ملے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے آیت فئے کے ذکر کے بعد فرمایا

والذین جاءوا من بعدھم	(اور وہ [مال غنیمت] [ان لوگوں
یقولون ربنا اغفر لنا و	کے لئے بھی ہے،) جو ان اگلوں
لاخواننا الذین سبقونا	کے بعد آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے
بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا	اور ہمارے ان سب بھائیوں
غلا للذین آمنوا ربنا	کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے
انک رؤف رحیم۔ (حشر-۲)	ہیں، اور ہمارے دلوں میں اہل
	ایمان کے لیے بغض نہ رکھ، اے ہمارے
	رب تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

چونکہ رافضی نہ اس کا قائل ہے، اور نہ اس پر عامل، اس لیے وہ مال فئے (غنیمت) کا مستحق بھی نہیں،[3] امام سبکی لکھتے ہیں کہ امام شافعی، عبد اللہ بن مبارک اور حضرت انسؓ کے سلسلہ سے منقول یہ روایت۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتعوذ من البخل، امام زعفرانی ہی سے مروی ہے، اس کے علاوہ شبابہ بن سوار، حضرت معاویہؓ اور ابوبکر بکراوی

[1] مدارک التنزیل، نسفی ج ۳ ص ۲۲۴ [2] طبقات کبری ص ۲۵۱ [3] ایضاً

اور حضرت منکدر بن جابرؓ کے سلسلوں سے کئی اہم روایتیں بھی امام زعفرانی سے مروی ہیں، ایک اور روایت امام زعفرانی سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے سات کنکریوں سے رمی جمار کیا، اور اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بائیں جانب اور عرفہ بائیں جانب تھا، پھر آپ نے فرمایا۔[1]

هذا مقام الذی انزلت علیه سورۃ البقرۃ۔ — یہی وہ جگہ ہے جہاں سورہ بقرہ نازل کی گئی تھی،

ان کے علاوہ عوالی کی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جنہیں سفیان بن عیینہ سے روایت کرنے میں وہ اور امام شافعیؒ شریکِ سلسلہ ہیں۔[2] امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ان سے روایت حدیث کی ہے۔[3]

امام زعفرانی کے شب و روز حدیث و فقہ کی دقیقہ رسیوں اور نکتہ سنجیوں میں گزرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ امام شافعیؒ کے اثر صحبت اور خود زبان پر ان کی بے مثل مہارت کی وجہ سے شعر و سخن کا ستھرا ذوق بھی ودیعت ہوا تھا، کبھی کبھی وہ خود بھی داد سخن دیتے، ان کے ایک شاگرد ابن مسروق ذکر کرتے ہیں، کہ ایک بار جب کہ امام زعفرانی کی نشست جاری تھی، ان کے ہم عصر و ہم درس اور ممتاز فقیہ ابو ثور تشریف لائے، کچھ دیر تبادلۂ خیال کے بعد جس میں کچھ نوک جھونک اور دلچسپ چوٹیں تھیں، وہ واپس چلے گئے، ان کے جانے کے بعد امام زعفرانی نے فرمایا لو چند شعر ہو گئے ہیں، سنو یہ کہہ کر مندرجہ ذیل اشعار سنائے ہے

أبد آبین المحبین جدال وقتال

---

۱ تاریخ بغداد ج۷، ص ۴۰۷، ۴۰۵، ۲ توالی التاسیس عسقلانی ص ۴۰ ۳ طبقات کبری ص ۲۵۱ ۴ تاریخ بغداد ج۷، ص ۴۰۷،

فاذا ما اعز یا من	ذاك شئ فاحب محال
لا یطب حب اذا ما	لم یکن فیه جدال
وامتناع من حبیب	عنده عز الوصال

ترجمہ:- محبت کرنے والے دلوں میں چھیڑ چھاڑ رضا مندی و نارضی رہتی ہی ہے، اگر ان میں یہ بات نہیں تو محبت دشوار ہے، محبت وہی اچھی ہے جس میں کچھ چوٹیں اور چشمکیں ہوں، محبوب کے وصل کی لذت اس کے بغیر مشکل ہے

ان اشعار کی سلاست، برجستگی اور خیال کی شوخی سے امام زعفرانی کے حسن ذوق کی ترجمانی ہوتی ہے، اچھے اشعار کی داد وہ ان کو گنگنا کر دیتے تھے، ایک موقع پر وہ یہ اشعار گنگنا رہے تھے۔

لا والذی تسجد الجباہ لہ	مالی بما دون ثوبها خبر
ولا بفیها ولا هممت بہ	ما کان الا الحدیث والنظر

ترجمہ:- خدا کی قسم مجھے اس کے بدن اور چہرہ کی خبر نہیں مجھے تو یار کی دید و شنید سے مطلب ہے

اشعار کی شوخی نے شاید مجلس کے کسی زاہد خشک شریک کو حیرت میں ڈال دیا وہ پوچھ بیٹھے کہ یا ابا علی ان هذا الیغنی بہ۔ اے ابو علی کیا یہ اشعار گنگنانے کے لائق ہیں، امام زعفرانی نے برجستہ فرمایا، ثکلتک، وھل یغنی الا بالشعر الجید برا ہو، ارے نفیس شعر ہی تو پڑھے جاتے ہیں۔[1]

تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب کی اس جامع و باکمال ہستی نے رمضان المبارک ۲۶۰ھ میں وفات پائی۔[2] سنہ وفات کے بارہ میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ سمعانی کی روایت ہے کہ

---

۱ تاریخ بغداد ج، ص ۴۰۸، ۲ ایضاً و طبقات کبری ج ۱ ص ۲۵۲

ربیع الآخر ۲۴۹ھ میں انتقال ہوا، ابن خلکان نے شعبان ۲۶۰ھ کا ذکر کیا ہے[1]، ایک روایت کے مطابق شعبان کے آخری دن انتقال ہوا[2] عسقلانی سال وفات ۲۵۹ھ یا ۲۶۰ھ قرار دیتے ہیں، لیکن راجح روایت اول الذکر ہی ہے کہ امام نووی بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں[3]

امام زعفرانی کو اللہ تعالے نے سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ بے نظیر حسن صورت کی نعمت سے بھی نوازا تھا، ان کی خوش خوئی وخوش روئی کے بارے میں طبقات السبکی میں ہے۔

لم یکن فی عصر الزعفرانی	امام زعفرانی کے زمانہ میں ان سے
احسن صورۃ منہ وانہ لم	بڑھ کر کوئی اور خوبصورت نہ تھا،
یتکلم فیہ احد لسوء[4]	نیز ان کے بارے میں کسی نے کوئی
	نازیبا بات نہ کہی۔

اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے باب میں امام احمد بن حنبلؒ کی یہ رائے بھی لائق ذکر ہے، جو انھوں نے اپنے برادرزادہ کو مخاطب کرتے ہوئے ظاہر کی تھی، کہ ما بلغنی عنہ الا بالخیر۔ یعنی ان (امام زعفرانی) کے بارے میں تو مجھے خیر کی خبر ہی ملتی رہی۔[5]

امام زعفرانی کی عظمت واقعی اور جلالت علمی کا اندازہ ان کے شاگردوں کی فہرست سے ہوتا ہے جس میں امام بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ جیسے عظیم المرتبت محدثین کے اسماء گرامی شامل ہیں، یعنی سوائے امام مسلم کے باقی ائمہ صحاح ان کے سرچشمۂ علم سے فیضیاب[6] ہوئے۔ ان حضرات کے علاوہ ابوالقاسم بغوی، ابن صاعد، زکریا ساجی، ابن خزیمہ، ابوعوانہ، محمد بن مخلد، ابوسعید بن الاعرابی، اسماعیل بن عباس، ابوعبید بن حربویہ اور

[1] وفیات ج ۱ ص ۲۲۹ [2] تاریخ بغداد ج ۷ ص [illegible]، [3] تہذیب الاسماء: نووی ج ۱ ص ۱۶۰

[4] طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۵۱ [5] تاریخ بغداد ج ۷ ص [illegible]

محدثین وفقہاء کا ایک پورا طبقہ ان کے سلسلۂ تلمذ میں نظر آتا ہے[1]۔ یہ وہ تلامذہ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی ذات کے لحاظ سے انجمن اور علم وعمل کی آبرو اور اپنے استاد وشیخ کے لیے متاع ناز ہے، البتہ تصنیفات کا ذکر نہیں ملتا، وہ امام شافعیؒ کے اقوال قدیم کے راوی ہیں، اور امام شافعیؒ کے مصر تشریف لے جانے کے بعد ان کے قدیم اقوال وآراء پر مشتمل ان کی فقہ کا بیشتر حصہ متروک ہوگیا، اس لیے امام زعفرانی کے املا کردہ رسالوں کے مقبول اور رائج ہونے کا امکان بھی زیادہ نہ رہا، انھوں نے امام شافعیؒ سے بیس رسالوں پر مشتمل ایک کتاب پڑھی تھی، جس کا املا بھی کیا، یہ کتاب کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہوئی[2]۔ ابوعاصم کا قول ہے کہ کتاب عراقی یعنی کتاب الام کا حصۂ قدیم امام زعفرانی ہی سے منسوب ہے[3]، لیکن اب یہ رسالے نایاب ہیں، امتداد زمانہ اور رد وقبول کے عمل کے نتیجے میں اب صرف ان کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، امام زعفرانی کے ایک قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی چند کتابیں اور بھی تھیں، ابو محمد بن بنت الشافعی، ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری کتابوں میں کتاب وسنت کے مفاہیم کا مطالعہ کریں، اور انھیں عام کریں۔ خواہ وہ ان معانی ومطالب کو مجھ سے منسوب کریں یا نہ کریں، ان کی یہ خواہش، ان کے استاد امام شافعیؒ کی خواہش کے عین مطابق ہے، امام شافعیؒ نے اپنے مرض الموت میں تقریباً انہی الفاظ میں اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

[1] طبقات السبکی، شیرازی، ابن ہدایہ، تاریخ بغداد ووفیات الاعیان وغیرہ۔ [2] الانتقاء: ابن عبدالبر ص ۱۰۵۔ [3] طبقات کبری ۱: ۲۵۱ [4] ایضاً۔

مطبوعات جدیدہ

شرح علی کتاب النفقات

تصحیح و تحشیہ مولانا ابوالوفا افغانی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ قیمت تحریر نہیں، ناشر:- مجلس احیاء المعارف النعمانیہ ۲۶۵۔۴ جلال کوچہ حیدر آباد۔

کتاب النفقات تیسری صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم ابوبکر احمد بن عمرو بن مہیر خصاف بغدادی کی تصنیف ہے، وہ دو واسطوں سے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے، ان کی یہ کتاب شرعی نان و نفقہ پر بہت قدیم ہے، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جو سب ناپید ہیں، صرف صدر شہید عمر بن عبد العزیز بن مازہ بخاری (م ۵۳۶ھ) کی شرح کا ایک نسخہ مدینہ منورہ کے کتبخانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں اور دو دیگر آستانہ میں موجود تھا، مولانا ابوالوفا افغانی نے ان دونوں کا عکس حاصل کرکے مقابلہ و تصحیح کے بعد ۱۳۶۵ھ میں پہلی دفعہ مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے شائع کیا، اب مجلس نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے، پہلے اڈیشن کی طرح یہ بھی خصاف کے متن، صدر شہید کی شرح اور مولانا ابوالوفا کے مقدمہ و حواشی پر مشتمل ہے، نفقات کو اسلامی قانون میں بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ ایک مسلمان پر خدا کے بندوں کا بڑا اہم اور ضروری حق ہے، قرآن مجید میں نکاح، طلاق، رضاع، اور وراثت کے ساتھ ساتھ اس کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ کتاب بڑی اہم ہے، مقدمہ میں نفقات کی اہمیت، کتاب و شرح کی خصوصیات اور مصنف و شارح کے مختصر حالات دیے گئے ہیں، قدما کی نادر و کمیاب کتابوں کی تلاش و اشاعت مجلس احیاء المعارف کا خاص امتیاز اور بڑا کارنامہ ہے، اس کتاب کی اشاعت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے لئے اہل علم کو مجلس کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ "ض"